ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

OPEN ACCESS

CC BY NC

**عامر انعام الحق**
ایم۔فل اُردو اسکالر، شعبہ اُردو، مسلم یوتھ یونیورسٹی اسلام آباد۔
**ڈاکٹر طالب حسین ہاشمی**
اسسٹنٹ پروفیسر (ایڈجنک)، شعبہ اُردو، مسلم یوتھ یونیورسٹی اسلام آباد۔

# منشایاد کی کتاب "منشایئے: "تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

**Amir Inam Ul Haq ***
M.Phil Urdu Scholar, Department of Urdu, Muslim Youth University Islamabad.
**Dr.Talib Hussain Hashmi**
Assistant Professor (Adjunct), Department of Urdu, Muslim Youth University Islamabad.
***Corresponding Author:**

# A Research and Critical Study of Munsha Yad's "Munshaiye"

This research presents a critical study of the intellectual, artistic and stylistic dimensions of Munshaiye, an important prose work by the distinguished Urdu writer Munsha Yad. The book is a rich collection of essays, literary sketches, memoirs, travelogues, critical writings and reflective prose that portrays the author's literary vision, cultural consciousness and creative excellence. The primary objective of this study is to explore the intellectual depth, artistic qualities and stylistic uniqueness of Munshaiye and to evaluate its contribution to modern Urdu prose. The study adopts a qualitative research methodology based on textual, descriptive and analytical approaches. It critically examines the thematic diversity of the book, including its portrayal of literary personalities, social values, cultural traditions, humor, satire, literary criticism, and human experiences. Particular attention has been paid to Munsha Yad's narrative techniques, language, diction, imagery, characterization and aesthetic expression. The research further investigates the balance between creative imagination and

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

critical insight that characterizes the author's prose. The findings reveal that Munshaiye is not merely a collection of literary essays but a significant literary document reflecting the intellectual and cultural landscape of its time. Munsha Yad's lucid language, objective criticism, subtle humor and realistic observations enrich the artistic value of the work and establish his distinctive place in contemporary Urdu literature. His writings successfully combine literary scholarship with creative expression, making the book a valuable source for understanding modern Urdu prose and literary criticism. The study concludes that Munshaiye possesses enduring literary significance and provides a strong foundation for further research in Urdu prose, stylistics, and literary criticism.

**Key Words:** *Munsha Yad, Munshaiye, Urdu Prose, Literary Criticism, Stylistics, Intellectual Dimensions, Artistic Expression, Research Study.*

اردو ادب کی نثری روایت اپنے دامن میں فکری گہرائی، فنی لطافت اور اسلوبیاتی تنوع کی ایک طویل تاریخ سموئے ہوئے ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اردو نثر نے مختلف اصناف کے ذریعے نہ صرف معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی عکاسی کی بل کہ انسانی فکر، احساس اور تجربات کو بھی مؤثر انداز میں بیان کیا۔ انشائیہ، خاکہ، سفر نامہ، خود نوشت، یادداشت اور تنقیدی مضامین اردو نثر کی وہ اصناف ہیں جنھوں نے ادب کو وسعت اور تنوع عطا کیا۔ ان اصناف کی ترقی میں متعدد ادیبوں نے نمایاں خدمات انجام دیں، جن میں منشایاد کا نام نہایت احترام سے لیا جاتا ہے۔ منشایاد اردو کے ممتاز افسانہ نگار، ناول نگار، کالم نویس اور نثر نگار ہیں۔ ان کی نثر میں فکری بصیرت، تہذیبی شعور، حقیقت نگاری، شگفتگی اور زبان و بیان کی دلکشی نمایاں ہے۔ ان کی کتاب " منشایئے "مختلف موضوعات پر مشتمل انشائیوں، خاکوں، یادداشتوں، ادبی مضامین اور تاثرات کا ایسا مجموعہ ہے جس میں مصنف کی علمی وسعت، ادبی ذوق، تنقیدی شعور اور تخلیقی صلاحیت بھرپور انداز میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس کتاب میں معاشرتی اقدار، انسانی رویے، ادبی شخصیات، ثقافتی مظاہر اور زندگی کے مختلف پہلو نہایت دلنشیں اسلوب میں پیش کیے گئے ہیں۔

زیرِ نظر تحقیق کا مقصد کتاب " منشایئے " کے فکری، فنی اور اسلوبیاتی پہلوؤں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لینا ہے۔ اس مطالعے میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ منشایاد نے اپنی نثر میں کس انداز سے فکری گہرائی، فنی مہارت اور منفرد اسلوب کو یکجا کیا ہے۔ نیز یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ان کی تحریروں میں زبان، بیان، منظر نگاری، کردار نگاری، مکالمہ، تشبیہات، استعارات اور ادبی حوالوں کا استعمال کس قدر مؤثر اور بامعنی ہے۔ یہ تحقیق معیاری تنقیدی

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

اصولوں اور متن کے تجزیاتی مطالعے پر مبنی ہے۔ اس کے ذریعے نہ صرف " منشایئے "کی ادبی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے بل کہ اردو نثر میں منشایاد کے مقام و مرتبہ کا بھی تعین کیا گیا ہے۔

منشایاد کی کتاب "منشایئے "ان کی ادبی بصیرت، تخلیقی ذہانت اور شگفتہ بیانی کا ایک شاندار مجموعہ ہے۔ یہ کتاب ادبی شخصیات، کتب، محافل اور ادبی سرگرمیوں پر ان کے مشاہدات، تاثرات اور فکری جائزوں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں شامل مضامین روایتی تنقید اور علمی مقالہ نگاری سے کہیں زیادہ تاثراتی اور مشاہداتی نوعیت کے حامل ہیں اور یہ پڑھنے والے کو ادبی دنیا کے لطیف پہلوؤں سے روشناس کرواتے ہیں۔ منشایاد نے ہر مضمون یا خاکے میں جو تاثر محسوس کیا اسے نہایت مخصوص اُسلوب اور شگفتہ بیانی کے ساتھ پیش کیا ہے جس میں نہ تو خوشامد یا مبالغہ آمیز تعریف پائی جاتی ہے اور نہ ہی کسی دل آزاری یا انتقام کا شائبہ۔ اس کتاب کی ترتیب اور انتخاب میں یہ خاص بات نظر آتی ہے کہ منشا یاد نے اپنی تحریروں میں ادبی شخصیات کے کردار، ان کی تخلیقی قابلیت اور محافل کی نزاکتوں کو حقیقت پسندانہ اور مؤثر انداز میں اجاگر کیا ہے تاکہ قارئین نہ صرف کتابوں اور ادبی شخصیات کی شناخت حاصل کریں بل کہ ان کے ذریعے ادبی محافل کے سماجی اور فکری ماحول سے بھی روشناس ہوں۔ اس طرح " منشایئے "نہ صرف ادبی تنقید اور تاثرات کا مجموعہ ہے بل کہ ایک زندہ دستاویز بھی ہے جو ادبی دنیا کے مختلف پہلوؤں، انسانوں اور محافل کے حقیقی رنگوں کو محفوظ کرتی ہے اور قارئین کو ایک تاریخی اور فکری ادبی تجربے سے روشناس کرواتی ہے۔ بقول منشایاد:

> " میں نے جس کتاب تحریر یا شخصیت سے جو تاثر لیا، اس کے بارے میں جو محسوس کیا اسے اپنے مخصوص انداز میں جسے آپ شگفتہ بھی کہہ سکتے ہیں، بیان کر دیا۔ میں نے اس شگفتہ بیانی کو منشایئے کا نام دیا ہے لیکن اس میں آپ کو خوشامد ، بلا جواز تعریف یا مبالغہ نہیں ملے گا اور نہ ہی دل کا ساڑ نکالنے یا انتقام لینے والی تنقید۔ "(۱)

منشایاد کی کتاب " منشایئے "ان کے شگفتہ اسلوب، فکری وسعت اور ادبی محبت کی خوبصورت مثال ہے۔ اس کتاب میں وہ تنقید کو تلخی کے بجائے نرمی اور توازن کے ساتھ پیش کرتے ہیں، جس سے ہر مضمون میں ایک مثبت اور تعمیری فضا قائم رہتی ہے۔ ان کی تحریروں میں ادبی بصیرت اور مشاہدے کی گہرائی نمایاں ہے جو قاری کو فکر اور

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

تخلیق کے نئے زاویے عطا کرتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب نہ صرف منشا یاد کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار ہے بل کہ ادب فہمی اور تنقیدی شعور کو جِلا بخشنے والی ایک اہم ادبی دستاویز بھی ہے۔ بقول فرخ جمیل:

> "زندگی کے تجربات اور کیفیات جو ایک عام آدمی محسوس کر سکتا ہے، منشا یاد ان کو اپنی تحریروں میں شامل کرتے تھے۔" (۲)

تنقیدی طور پر دیکھا جائے تو "منشایئے" کو سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

کتاب کا پہلا باب "منشایئے" کے عنوان سے ہے جس میں مجموعی طور پر دس مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین مختلف مواقع پہ پڑھے گئے تھے جن میں کہیں سنجیدہ تو کہیں شگفتہ انداز اپنایا گیا ہے۔ اس عنوان کے تحت پہلا مضمون "حسب منشا" ہے۔ یہ مضمون بنیادی طور پر منشا یاد کی اپنی ادبی اور ذاتی شناخت کے سفر کی داستان ہے جس میں کہانی، شاعری، تخلص اور ادبی فضا کے مختلف پہلوؤں کو نہایت دل چسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں سب سے نمایاں فکر یہ ہے کہ ایک ادیب اپنی تخلیقی شخصیت کو کس طرح بتدریج تراشتا ہے اور زمانے کے بدلتے حالات میں اپنی پہچان کو قائم رکھنے کے لئے کن کن عملی اور فکری مراحل سے گزرتا ہے۔ مثال کے طور پر ابتدا میں وہ بتاتے ہیں کہ کہانی ان کے گھر کی "پڑچھتی پر کتابوں میں سوئی پڑی رہتی" اور یہی قربت بعد میں پوری زندگی کا تعین کرتی ہے۔

راولپنڈی میں آکر "چچا چونچ" کے کالم سے ادبی سفر کا آغاز اور پھر "یاد بھٹی" سے ہوتے ہوئے "منشا یاد" تک قلمی ناموں کی یہ تبدیلی محض ظاہری نہیں بلکہ ایک گہرا تخلیقی ارتقا ہے جو ان کی ادبی شناخت کی تشکیل کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ اپنے تجربات، خصوصاً "چھٹی والے دن کا مانیٹر" جیسے واقعات کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ ایک معمولی سی کیفیت بھی وقت کے ساتھ فخر اور کامیابی کی علامت بن جاتی ہے۔ اس طرزِ اظہار سے واضح ہوتا ہے کہ منشا یاد اپنی تخلیقی ذات کو ذاتی نمود یا شہرت کے بجائے مسلسل جدوجہد اور سماجی تجربے کے تناظر میں دیکھتے ہیں، جو ان کے فکری اور ادبی شعور کی پختگی کو نمایاں کرتا ہے۔ (۳)

اس مضمون میں طنز و مزاح اور سنجیدہ فکری عناصر کی آمیزش ایک ایسا دل چسپ ادبی منظر نامہ تشکیل دیتی ہے جو نہ صرف انفرادی تجربات کو اجاگر کرتی ہے بلکہ اس عہد کی ادبی و سماجی فضا کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ جب وہ "چوہڑ کانوی" جیسے ممکنہ تخلص پر طنزیہ انداز میں اظہارِ خیال کرتے ہیں یا "محمد مرضی چیتا" کے لطیفے کو بیان کرتے

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

ہیں تو ان کی زندہ دلی، حاضر دماغی اور خود احتسابی کا پہلو سامنے آتا ہے۔ اسی طرح بابائے ظرافت سید ضمیر جعفری کا انہیں "حسب منشا" کہنا اور احمد فراز کا فی البدیہہ مصرع کہنا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ ادبی حلقوں میں ایک منفرد اور مؤثر مقام رکھتے تھے۔ اس تناظر میں ان کی شخصیت نہ صرف مقبول تھی بلکہ تخلیقی دنیا میں باوقار شناخت کی حامل بھی تھی۔ اس پس منظر میں ان کے مذکورہ مضمون سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "بعض شاعروں نے میرے بارے میں بہت اچھی اچھی آرا کا اظہار بھی کیا ہے۔ ان میں انور مسعود، اختر شیخ، سرفراز شاہد، ماجد صدیقی، محیط اسماعیل بشیر حسین ناظم اور بعض دیگر احباب بھی شامل ہیں۔" (۴)

مجموعی تنقیدی جائزے سے یہ حقیقت نمایاں ہوتی ہے کہ منشایاد نے اپنی تخلیقی بصیرت کے ذریعے اپنے عہد کی ادبی تقاضوں، معاشرتی رویوں اور ذاتی مشاہدات و تجربات کو نہایت ہنرمندی سے یکجا کیا ہے۔ یہی امتزاج ان کی شخصیت اور فن کو انفرادیت بخشتا ہے اور ان کی تحریروں کو محض وقتی اظہار کے بجائے ایک پائیدار ادبی شناخت عطا کرتا ہے۔

دوسرے مضمون کا عنوان "ماموں سے ماموں تک" ہے۔ اگر اس مضمون کا فکری اور تنقیدی زاویے سے جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ بظاہر یہ ایک خوش گوار، شگفتہ اور یادداشت پر مبنی تحریر ہے جس میں ماموؤں اور بھانجوں کے باہمی تعلقات کو دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے، لیکن اس کے باطن میں اپنے عہد کے سماجی، فکری اور تہذیبی رویوں کا ایک گہرا مطالعہ موجود ہے۔ منشایاد نے محض خاندانی واقعات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک ہی خاندان کے دو مختلف ذہنی و فکری میلانات کو علامتی انداز میں پیش کیا ہے، جو دراصل اس دور کے معاشرے میں موجود فکری کشمکش کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایک جانب بڑے ماموں کی شخصیت ہے جو دین داری، تقویٰ، علم و فضل، اخلاقی استقامت اور روایتی اقدار کے امین ہیں۔ وہ نہ صرف خاندان بلکہ پورے علاقے میں عزت و وقار کی علامت سمجھے جاتے ہیں اور ادب و فن کو بھی مذہبی اور اخلاقی پیمانوں پر پرکھتے ہیں، یہاں تک کہ وارث شاہ کے بعض نسبتاً بے تکلف اشعار بھی ان کی طبیعت پر گراں گزرتے ہیں۔ دوسری طرف منشایاد خود ایک ایسے حساس اور وسیع النظر تخلیق کار کے طور پر سامنے آتے ہیں جن کے ذوق میں ادب، موسیقی، فلم اور جمالیاتی شعور نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے بھانجے کو جگجیت سنگھ کی غزلوں کی کیسٹیں تحفے میں دیتے ہیں اور فنونِ لطیفہ کو انسانی احساسات کی لطافت اور تہذیبی شعور کے اظہار کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

یہ دو متضاد رویے دراصل روایت اور جدیدیت، مذہبی احتیاط اور جمالیاتی آزادی، نیز قدامت اور عصری شعور کے درمیان موجود فکری مکالمے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ تاہم منشایاد کی فنی مہارت کا کمال یہ ہے کہ وہ اس اختلاف کو تصادم یا کشیدگی کی صورت میں پیش نہیں کرتے بلکہ محبت، احترام، ظرافت اور خاندانی قربت کے ماحول میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ قاری کے سامنے ایک فطری اور جاندار منظر نامہ ابھر آتا ہے۔ فلم *مرزا غالب* کو محض "ڈراما" قرار دینے پر ماموں اور بہن کے درمیان ہونے والی بحث یا سورۂ یٰسین کا ریکارڈ چلا کر ڈانٹ سے بچنے کا واقعہ محض مزاحیہ حکایات نہیں بلکہ ان کے پس منظر میں موجود سماجی نفسیات، مذہبی حساسیت اور تہذیبی رویوں کی عکاسی کرتے ہیں۔

اس اعتبار سے یہ مضمون شخصی یادداشت کی حدود سے بلند ہو کر ایک عہد کی فکری تاریخ، معاشرتی نفسیات اور خاندانی اقدار کا معتبر ادبی دستاویز بن جاتا ہے۔ منشایاد اپنی مخصوص شگفتہ، بے تکلف اور مکالماتی نثر کے ذریعے یہ باور کراتے ہیں کہ مختلف نظریات اور ذوق رکھنے والے افراد کے درمیان احترام، محبت اور باہمی قبولیت کا رشتہ برقرار رہ سکتا ہے۔ یہی فکری وسعت، انسانی رواداری اور تہذیبی شعور اس مضمون کو محض ایک یادگار واقعہ نگاری کے بجائے عہد، معاشرے اور انسان کے باہمی تعلقات پر ایک بامعنی ادبی اظہار کی حیثیت عطا کرتا ہے۔

اس تحریر کا ایک نہایت اہم اور قابلِ توجہ پہلو ادبی روایت کے تسلسل اور خاندانی علمی ماحول کی عکاسی ہے۔ منشایاد اس امر کو نہایت فطری انداز میں واضح کرتے ہیں کہ ادب سے وابستگی محض انفرادی ذوق کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ اس کی تشکیل میں خاندانی ماحول، بزرگوں کی صحبت اور اجتماعی ادبی سرگرمیوں کا بنیادی کردار ہوتا ہے۔ بڑے ماموں کی محفلیں اس روایت کی نمایاں مثال ہیں، جہاں مولوی احمد علی جیسے زندہ دل اور ادب شناس احباب کی موجودگی میں شیخوپورہ کے مخصوص تمباکو کی چلم کے ساتھ رات گئے تک نظم و نثر کی منتخب تخلیقات پڑھی اور سنی جاتی تھیں۔ یہ محفلیں محض تفریح یا وقت گزاری کا ذریعہ نہیں تھیں بلکہ ادب کے ذوق، تنقیدی شعور اور تہذیبی اقدار کی غیر رسمی درس گاہوں کی حیثیت رکھتی تھیں، جہاں نئی نسل ادب سے شناسائی حاصل کرتی اور تخلیقی احساس پروان چڑھتا تھا۔

منشایاد اس ادبی روایت کو جامد یا موروثی سرمایہ قرار نہیں دیتے بلکہ اس کی ارتقائی نوعیت کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر نسل روایت کو من و عن قبول کرنے کے بجائے اپنے فکری، سماجی اور نفسیاتی تقاضوں کے مطابق اس میں تبدیلی اور وسعت پیدا کرتی ہے۔ یہی تصور ان کے طنزیہ مگر بامعنی جملے، ”میرے ماموں مجھے

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

صرف ڈانٹا کرتے تھے، میں نے خلیق کی پٹائی بھی کی" میں پوری معنویت کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ بظاہر یہ ایک مزاحیہ فقرہ ہے، لیکن اس کے پس منظر میں روایت کے تسلسل کے ساتھ اس میں پیدا ہونے والی تبدیلی، نسلوں کے مزاج کا فرق اور سماجی رویوں کی ارتقائی کیفیت پوشیدہ ہے۔ گویا نئی نسل بزرگوں سے صرف روایت ورثے میں نہیں لیتی بلکہ اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق اس کی نئی تعبیر بھی کرتی ہے۔

اس زاویۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ مضمون محض دو ماموؤں یا ایک خاندانی تعلق کی داستان نہیں رہتا بلکہ خاندانی روایت، ادبی تربیت، تہذیبی اقدار، مذہبی رجحانات اور جدید فکری میلانات کے باہمی تعامل کا ایک گہرا مطالعہ بن جاتا ہے۔ منشا یاد شخصی یادداشت کو اس فنی مہارت سے اجتماعی تجربے میں ڈھالتے ہیں کہ قاری کو ایک پورے عہد کی ثقافتی فضا، ادبی محفلوں کی روایت، نسلوں کے بدلتے ہوئے مزاج اور فکر و فن کے ارتقا کا واضح احساس ہونے لگتا ہے۔ یہی خصوصیت اس مضمون کو سوانحی یادداشت کی سطح سے بلند کر کے تہذیبی شعور، ادبی روایت اور سماجی تبدیلی کے ایک اہم تنقیدی متن کی حیثیت عطا کرتی ہے۔

تیسرا مضمون "عالم خیال میں مکالمہ" فکری اور موضوعاتی اعتبار سے ماں کی یاد، شعری وجدان اور جذباتی وابستگی کو ایک مکالماتی اُسلوب میں پیش کرتا ہے۔ اصل طاقت اس بات میں ہے کہ خلیق کی نظموں پر گفت گو براہِ راست اس کی مرحومہ ماں سے خیالی مکالمے کی صورت میں کی گئی ہے۔ یہ اُسلوب اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ خلیق کی شاعری صرف ذاتی اظہار نہیں بل کہ ایک ایسی تخلیق ہے جو ماں کی جدائی کے کرب سے جنم لیتی ہے۔ جملہ ماں کی جدائی نے آپ کو بھی کتابوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا اور آپ کہانیاں لکھنے پڑھنے لگ گئے تھے اس بات کا ثبوت ہے کہ والدین کی جدائی محض ذاتی نقصان نہیں بل کہ تخلیقی محرک بھی بن جاتی ہے۔

مکالمے میں بار بار خلیق کی نظموں کے اقتباسات واضح کرتے ہیں کہ خلیق کے ہاں منظر نگاری، بارش، شام اور پرندے محض علامات نہیں بل کہ جذباتی یادداشت کا حصہ ہیں۔ منشا یاد نے یہ دونوں مضامین چوں کہ اپنے بھانجے خلیق الرحمٰن کے شعری مجموعوں کی تقریب رونمائی کے موقع پر پڑھے تھے اور ایک موقع پر تو ان کی بہن بھی اس تقریب میں شامل تھیں اس لیے ان کا انداز بیاں نہایت اپنائیت والا ہے۔ ان مضامین سے جہاں خاندانی سطح پر ان کے باہمی انس کا پتہ چلتا ہے وہاں خاندان بھر کا ادبی ذوق بھی عیاں ہوتا ہے۔ ان مضامین کی وجہ تخلیق پر تبصرہ کرتے ہوئے منور امین یوں رقم طراز ہیں:

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

"اس حصے کا دوسرا اور تیسرا مضمون اپنے بھانجے خلیق الرحمن کی شاعری کی کتابوں "کنول جھیل کا گیت" اور "دامن کوہ میں شام" کی تقریب رونمائی میں پڑھے گئے۔"(۵)

کتاب کے اس باب میں شامل ایک اور مضمون "بعض کام بعضوں کو نہیں آتے" کے عنوان سے ہے۔ منشا یاد اس مضمون میں ہنسی کی تہ کے ساتھ ایک سنجیدہ نکتہ اٹھاتے ہیں کہ سیکھنے کی قدرت عام ہے مگر مہارت کا ذوق ہر ایک کو نہیں ملتا۔ آغاز ہی میں وہ اعتراف کرتے ہیں کہ ڈرائیونگ سیکھ لینا کمال نہیں اور اس کے ثبوت میں حادثوں کی کثرت کا حوالہ آتا ہے۔ طنز بھرا جملہ چُبھتا ہے کہ مرنے کے بعد ہی آدمی بے لاگ سچ بول سکتا ہے مگر نہ جنت سے کوئی تار آتا ہے نہ جہنم سے۔ اسی فکری دھاگے کو وہ سڑک پر دو سائیکل سواروں کی ٹکر سے باندھتے ہیں جہاں سنسان اور کشادہ سڑک پر ٹکر ہونا اتفاق نہیں بل کہ روزمرہ مہارت کی کمی کا استعارہ بن جاتا ہے۔ مرکزی قضیہ پھر اس فیصلے میں مرتکز ہوتا ہے کہ بعض لوگ بعض کاموں کے لیے پیدا نہیں ہوتے۔ مثال خالو صاحب کی ہے کہ برسوں سے سائیکل چلا رہے ہیں لیکن ہنوز چڑھنے اور اترنے کا سلیقہ حاصل نہ ہو سکا۔ یہاں وہی روزمرہ کو فکر بن جاتا ہے۔ سوار ہونے کے لیے ہمیشہ منڈیر ڈھونڈنا اور اترنے کو گرنے کے سے انداز میں پاؤں ٹکا دینا ایک بدن کے سیکھے ہوئے مگر ادھورے سانچے کی علامت ہے۔ اس داخلی منطق سے منشا یاد اس سادہ مگر اہم نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ محض مشق نہیں بل کہ موافق خمیر بھی درکار ہے اور یہ خمیر ہر مزاج میں یکساں نہیں گوندھا جاتا۔

دوسرے حصے میں یہی نکتہ گھریلو اور دفتری معمولات میں کھلتا ہے اور انسانی صلاحیت کی کثرت رنگی سامنے آتی ہے۔ ایک شخص ازار بند ڈالنے جیسا معمولی کام سر انجام نہیں دے سکتا اور جب جوش میں کامیاب ہوتا ہے تو ازار بند بیچ سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی طرح اس مضمون میں بتاتے ہیں کہ بال پوائنٹ کی ایجاد کا اصل مصرف شاید یہی تھا کہ اس سے لکھنا بھی ہو اور ازار بند بھی ڈل جائے۔ ریڈیو پر لاہور کے بجائے پشاور لگ جانا اور ٹیلی فون کوڈ بھول کر نمبر ملانا پھر بھی پاس پڑوس میں جا لگنا جدید وسائل کے باوجود بدنصیب مہارت کی کہانی ہے۔ ممتاز مفتی کار کے ایک حادثے کے بعد تادم آخر سکوٹر کو اپنا بائیسکل کہتے رہے اور رشید امجد سگنل پر بریک کی جگہ پاؤں رگڑتے رہے اور ڈش کی ایل این بی

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

تھامنے کے لیے ضد کر بیٹھے کہ تم طریقہ بتاؤ میں رات بھر ایل این بی کو ہاتھ سے پکڑ کر کھڑا رہوں گا۔

آخر میں اٹیچی میں کپڑے تہ کر کے رکھنا بھی معمہ رہتا ہے اور فیصلہ ایک معصوم تجربے پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ دو انگلیاں منہ میں ڈال کر سیٹی بجتی ہے یا نہیں۔یوں منشا یاد مزاح کے پردے میں ایک اخلاقی مقدمہ قائم کرتے ہیں کہ انسانوں کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں متنوع ہیں۔کوئی ہوائی جہاز اڑا لیتا ہے مگر اونٹ سے گھبرا جاتا ہے۔کوئی ازار بند نہیں ڈال پاتا مگر بھینس دوہ لیتا ہے۔یہی اختلاف حیات کو معقول بناتا ہے۔یہی فرق ہمیں دوسروں کے عجز پر ہنساتے ہوئے خود احتسابی کی طرف بھی موڑ دیتا ہے کہ فن اور ہنر صرف دستور نہیں مزاج بھی ہیں۔اس مضمون میں منشایاد نے اپنے مشاہدے کی گہرائی اور بیان کے تیکھے پن کی مدد سے افراد اور سماج کے چھوٹے چھوٹے پہلوؤں کو کمال مہارت سے بیان کر کے ان میں مزاح اور فکر کا ملا جلا تاثر پیدا کر دیا ہے۔منشایاد کے مشاہدے کی گہرائی اور بیانیہ سچائی کا اعتراف کرتے ہوئے محمد علی صدیقی یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

> "وہ بلند آہنگی سے بچتا ہے اور اس طرح اپنے مشاہدے کو ایک سچ اور صرف ایک سچ کے طور پر بیان کرتا ہے۔"(۶)

منشا یاد نے مضمون "اداسی" میں اس جذبے کو محض ایک کیفیت یا ذاتی تجربے کے طور پر نہیں دیکھا بل کہ اسے تخلیقی اظہار کا لازمی محرک قرار دیا ہے۔مضمون کے آغاز سے واضح ہوتا ہے کہ اداسی ان کے نزدیک محض افسردگی نہیں بل کہ وہ روحانی توانائی ہے جو تخلیقی سطح پر ذہن کو مہمیز دیتی ہے۔اداسی ایک اذیت ناک کاٹنے والی شے ہے لیکن یہی ڈسنا تخلیقی اظہار کے لیے مواد مہیا کرتا ہے۔

موضوعاتی طور پر یہ مضمون اس خیال پر مبنی ہے کہ شاعری، افسانہ اور ہر قسم کا ادبی تخلیق محض ذہنی مشق نہیں بل کہ جذبات کے دباؤ اور اداسی کی کوکھ سے جنم لینے والا عمل ہے۔موسیقی اور شاعری کو اداسی پیدا کرنے کے ذریعہ بتایا ہے۔اداسی کوئی منفی کیفیت نہیں بل کہ ایک تہذیبی و تخلیقی قوت ہے جو انسان کو جمالیاتی سطح پر بلند کرتی ہے اور اندر کی میل کچیل دھو ڈالتی ہے۔اس پس منظر میں منشایادیوں بیان کرتے ہیں:

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

"تنہائی کے علاوہ ایک خاص قسم کی اداسی کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس میں مبتلا ہوئے بغیر میرا قلم اور ذہن رواں نہیں ہوتے۔ البتہ کوئی چلتا سا مضمون، کوئی فرمائشی تقریر یا روایتی قسم کا سکرپٹ لکھنا ہو تو مجھے تنہائی اور اداسی کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔" (۷)

مضمون کے دوسرے حصے میں اداسی کے خارجی اور داخلی مظاہر کی ایک طویل فہرست سامنے آتی ہے جو اسے ایک آفاقی اور ہمہ گیر تجربہ بنا دیتی ہے۔ مثال کے طور پر شہنائی سن کر شادی اور رخصتی کا دیکھا یا ان دیکھا منظر دکھائی دینے لگتا ہے یا سارنگی کی آواز یوں آدمی کے اندر دھنس جاتی ہے جیسے سردیوں کی ہلکی بارش زمین میں۔ یہ حوالے واضح کرتے ہیں کہ اداسی محض داخلی واردات نہیں بل کہ مخصوص آوازوں، مناظر اور یادداشتوں سے جڑی ایک ثقافتی اور اجتماعی کیفیت بھی ہے۔ اسی ربط کو وہ آگے بڑھاتے ہیں کہ کویل کی آواز "سرتاپا اداسی کا گیت ہے" اور منڈیر پر بیٹھا کوا ہماری داخلی تنہائی کی مجسم شکل ہے۔ ان تصویری حوالوں سے اداسی کو ایک تخلیقی و علامتی ڈھانچے میں ڈھالا گیا ہے۔ پھر وہ اسے محرومی، نارسائی، غربت اور بے بسی تک پھیلاتے ہیں اور یہاں تک نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ کائنات ایک عظیم تخلیق کار کی اداسی کا اظہار ہے جو لا متناہی تسلسل تنہائی اور یکسانیت سے گھبرا کر پیدا کی گئی ہوگی۔ اس جملے میں اداسی کو کائناتی سطح پر تخلیق کی محرک قوت قرار دیا گیا ہے۔ موضوعاتی لحاظ سے یہ مضمون محض ایک جذباتی واردات نہیں بل کہ ایک فلسفیانہ بیانیہ بھی ہے جو اداسی کو فرد کی تخلیق، معاشرت کی علامت اور کائنات کی تخلیق تک جوڑ دیتا ہے۔ یوں یہ تحریر منشا یاد کے فکری کینوس کی وسعت اور ان کے مشاہدے کی باریک بینی کو اجاگر کرتی ہے۔

منشا یاد کے مضمون "اُردو ادب میں طنز و مزاح" میں ادبی روایت اور عصری تناظر دونوں کو سامنے رکھ کر طنز و مزاح کے ارتقا اور اس کی وسعتوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ آغاز ہی میں وہ اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ طنزیہ و مزاحیہ ادب کے معیار عموماً کسی معاشرت کی ذہنی اور تخلیقی ترقی اور ترفع کا اندازہ لگانے کا پیمانہ ہوتے ہیں۔ اپنے اس مضمون میں وہ اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ ہنسنے اور مسکرانے کی جبلت انسان کی فطرت میں شامل ہے اور اسی جبلت نے ہر معاشرت میں طنز و مزاح کو فروغ دیا۔ تاریخی تناظر میں وہ بتاتے ہیں کہ آزادی کے بعد اُردو شاعری اور نثر دونوں میں طنز

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

و مزاح نے بھرپور انداز میں جگہ بنائی۔ خضر تمیمی کی تحریفات، عاشق محمد غوری کی تضمینات، شوکت تھانوی اور مجید لاہوری کے اشعار اور حاجی لق لق کے فقرے اس بات کے گواہ ہیں کہ اُردو شاعری کے دامن میں یہ روایت کتنی رنگین اور متنوع رہی ہے۔ اسی طرح انور مسعود، انعام الحق جاوید اور سرفراز شاہد کو وہ بطور نمایاں مثال پیش کرتے ہیں اور اس امر پر زور دیتے ہیں کہ پنجابی زبان کی بلند آہنگی اور مزاج کی شوخی نے اسے ہنسی مذاق اور ظریفانہ اظہار کے لیے اور زیادہ موزوں بنا دیا ہے۔ اس پس منظر میں ان کے مذکورہ مضمون سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "آپ جانتے ہوں گے کہ جتنے لطیفے پنجابی زبان میں ہیں وہ شاید ہی کسی اور زبان میں ہوں یا ان کا ویسا مزہ کسی دوسری زبان میں آتا ہو جیسا پنجابی میں آتا ہے۔" (۸)

اسی طرح اس مضمون میں منشا یاد طنز و مزاح کے نثری سرمایہ پر بھی گفت گو کرتے ہیں اور اسے شعری روایت سے بھی زیادہ طاقتور قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، سید ضمیر جعفری، ابن انشاء، پطرس بخاری اور مشتاق احمد یوسفی نے نثر کے ان اعلیٰ معیاروں کو چھوا ہے جو کسی بھی ترقی یافتہ زبان و ادب کا سرمایہ افتخار ہوتے ہیں۔ یہاں وہ نثر کی مزاحیہ روایت کو محض انفرادی صلاحیت کا نتیجہ نہیں بل کہ ایک اجتماعی تہذیبی ورثہ قرار دیتے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی اور ابو الاثر حفیظ جالندھری کے بارے میں ابن انشاء ان کے الفاظ طنز کی اس کاٹ کو ظاہر کرتے ہیں جو صرف تفریح نہیں بل کہ سماجی شعور اور فکری بالیدگی پیدا کرتی ہے۔ منشا یاد اس مضمون میں طنز و مزاح کے مستقبل کو بھی ملک کی سماجی اور سیاسی حالت سے مشروط کرتے ہیں اور روسی ادیب ایوان کریلوں کی حکایت "اور بلاؤ" کے حوالے سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب تک احتساب اور انصاف کی روایت مضبوط نہیں ہوگی تب تک طنز و مزاح محض انفرادی دل لگی رہے گا۔ یوں یہ مضمون صرف ادبی تاریخ کا بیان نہیں بل کہ ایک فکری مقدمہ بھی ہے جس میں طنز و مزاح کو معاشرتی صحت اور فکری بالیدگی کے پیمانے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

"منشائیے" میں شامل منشا یاد کا سفر نامہ "اسلام آباد سے چولستان تک" ایک ذاتی مشاہدے یا سفر اور ایک عہد کے ادبی اور سماجی منظر نامے کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں ایک طرف ادیبوں اور شاعروں کی رفاقت، ان کی محفلیں اور اختلافات ہیں تو دوسری طرف صحرائی زندگی کے رنگ اور تاریخی آثار کا

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

بیان۔ آغاز میں اسلام آباد کے خوش گوار موسم اور بہاول پور کے سفر کی تیاری کا ذکر قاری کو اس ماحول میں لے جاتا ہے جہاں ادیب دوستوں کے ساتھ ملاقاتوں اور نشستوں کا سلسلہ جاری ہے۔ ممتاز ملک، اجمل ملک، جمیلہ ہاشمی، علی تنہا اور نوشی گیلانی جیسے نام اس سفر کو محض جغرافیائی نہیں بل کہ ادبی اور فکری رنگ عطا کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک موقع پر جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے گرفتاری کی دھمکی دی تو ممتاز ملک کا یہ جملہ کہ "سارا الزام میرے سر لے لیجیے" دوستی اور رفاقت کی ایسی جھلک پیش کرتا ہے جو اس سفرنامے کے بیانیے کو انسانی سطح پر اور بھی قیمتی بنا دیتا ہے۔

چولستان کا بیان اس سفرنامے کی جان ہے۔ آفتاب احمد شاہ کی جیپ، ریورس گیئر کی خرابی اور سراج منیر کے ہنسی مذاق بھرے اشعار ایک ایسے صحرا کو زندہ کر دیتے ہیں جو محض ویرانی نہیں بل کہ زندگی، ہنسی، اور دوستی کی یادوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس مضمون میں سراج منیر کی پیروڈی اس ہچکولے کھاتے سفر کو ادبی محفل میں بدل دیتی ہے۔ صحرا کے مشاہدے میں جہاں سرسبز کھیتوں کے بعد ریتلے ٹیلے اور ٹوبھے جیسے الفاظ صحرائی زندگی کی اصل حقیقت اجاگر کرتے ہیں، وہیں خواجہ غلام فرید کی کافیوں کا حوالہ اس بیان کو روحانی اور ثقافتی گہرائی عطا کرتا ہے۔ قلعہ دراوڑ کی فصیلیں اور اس کے قریب عورتوں کا پانی بھرنا اس تضاد کو نمایاں کرتے ہیں جہاں ایک طرف تاریخ کی عظمت ہے تو دوسری طرف حال کی مشقت۔

یہ سفرنامہ سیاحت تک محدود نہیں رہتا بل کہ ادبی مباحث کا آئینہ بھی ہے۔ معاصر افسانے کی بحث کو ایک وسیع تناظر میں رکھ دیتے ہیں۔ ان آرا کے جواب میں انتظار حسین کی مدلل تردید اور سراج منیر کی یہ رائے کہ جدیدیت کے نام پر کہانی کا چہرہ بگاڑنے والوں نے برسوں ضائع کیے ہیں ادبی فضا میں تناؤ اور مکالمے کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ یوں یہ سفرنامہ ایک طرف قلعہ دراوڑ کی بلند فصیلوں اور ہرن کی چوکڑیوں کا منظرنامہ ہے تو دوسری طرف اس عہد کی ادبی کش مکش اور فکری رویوں کی تصویر بھی۔

منشا یاد کے مضمون "سفر دوستی کا" میں پاک چین رفاقت کو ادبی اور تہذیبی سطح پر اجاگر کیا گیا ہے اور اس حقیقت کو نمایاں کیا گیا ہے کہ ادیب محض مشاہدہ کرنے والا نہیں بل کہ محبت اور انسانی رشتوں کا سفیر ہوتا ہے۔ مضمون میں وہ اس کتاب کا حوالہ دیتے ہیں جو یوان ینگ اور چو منگ نے

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

مرتب کی اور جس میں سولہ چینی ادیبوں کے تاثرات شامل ہیں جو "سفر دوستی کا۔پاکستان چینی ادیبوں کی نظر میں" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئی۔اس کتاب میں وہ تاثرات ہیں جو انھوں نے پاکستان کا سفر کرنے کے بعد اپنی زبان میں قلم بند کیے۔منشا یاد اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ اُردو میں اس کتاب کی اشاعت نہایت اہم ہے کیوں کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ اور خصوصاً چینی ادیب ہمارے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں اور ہمارا ملک اور لوگ انھیں کیسے دکھائی دیتے ہیں۔اس بیان سے یہ فکر ابھرتی ہے کہ دوستی صرف حکومتی سطح پر قائم نہیں رہتی بل کہ ادیبوں کے احساسات اور عوامی سطح کی گرمجوشی سے جڑ کر زیادہ دیرپا اور گہری ہوتی ہے۔مضمون میں بار بار اس حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے کہ محبت کا اظہار ضروری ہے اور ادیب اسی اظہار کا سب سے موثر ذریعہ ہیں۔اس پس منظر میں مضمون "سفر دوستی کا" سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "اس کتاب کے مطالعے کے دوران میں سب سے پہلے تو جناب یو ان وئے شوئے کا خوب صورت ترجمہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔پھر چین کے نامور ادیبوں کی پاکستان اور پاکستانیوں کے بارے میں آرا پڑھ کر یہ خوشی دو چند ہو جاتی ہے۔جتنا خلوص ، محبت اور دوستی کا اظہار پاکستانیوں نے ان کے دوروں کے دوران کیا، انھوں نے اتنے ہی خلوص، سچائی اور محبت سے اس کا ذکر اپنی تحریروں میں کیا۔علا مہ اقبال کی شاعری اور چینیوں کے بارے میں ان کے اشعار کا وہ بار بار حوالہ دیتے ہیں۔"(۹)

منشایاد کی اس کتاب کا دوسرا باب "یادِ رفتگاں " کے عنوان سے ہے۔اس باب میں مجموعی طور پر سات تاثراتی مضامین شامل ہیں جو ان احباب کے متعلق ہیں جن سے ان کی رفاقت رہی ہے۔ان شخصی رفاقتوں کے احوال سے سلسلے میں پہلا مضمون "منفرد اور ممتاز" کے عنوان سے ممتاز مفتی کی شخصیت پر مبنی ہے۔اس تحریر میں منشا یاد نے نہ صرف مفتی صاحب کے ساتھ اپنے قریبی تعلقات کا ذکر کیا ہے بل کہ ان کی تخلیقی عظمت، روزمرہ زندگی، ادبی رویوں اور ذاتی عادات کو بھی بے حد محبت اور ہلکے طنز و مزاح کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔اس تحریر کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ یہ محض ایک رسمی تعارف یا سوانحی خاکہ نہیں بل کہ یادوں، مشاہدات اور ذاتی تجربات پر مشتمل ایک دل نشین مرقع ہے۔ممتاز مفتی کی خوش مزاجی،

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

شوخی، تخلیقی توانائی، خواتین اہل قلم سے بے تکلف رویہ، نقادوں اور جدیدیت پسند افسانہ نگاروں کے ساتھ ان کے ہلکے پھلکے مذاق اور اپنی روزمرہ ضروریات میں دوستوں کو شریک کرنے کے انداز کو نہایت حقیقت پسندانہ رنگ میں دکھایا گیا ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ سے یہ تاثر اور قوی ہوتا ہے کہ منشایاد جس طرح اپنی افسانوی کرداروں سے محبت رکھتے ہیں اسی طرح عملی زندگی میں موجود ان دوست احباب ان کے لیے زندگی کی کمک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں اپنے رفقا کے بارے میں ایک خاص قسم کا مؤدبانہ انس پایا جاتا ہے۔ بقول یونس جاوید:

> "منشایاد محبت کرنے والا غم گسار بھی ہے جو اپنے تخلیق کردہ کرداروں سے لے کر دوستوں تک کو نگاہ میں رکھتا ہے۔" (۱۰)

موضوعاتی طور پر یہ دیباچہ ممتاز مفتی کے فن اور شخصیت دونوں کا احاطہ کرتا ہے۔ فن کے حوالے سے ان کی افسانہ نگاری میں انسانی شخصیت کی پیچیدگیوں، کرداروں کے کثیر الجہتی پہلوؤں اور بدلتے ہوئے سماجی پس منظر کے ساتھ فن میں ارتقا کا ذکر کیا گیا ہے۔ شخصیت کے حوالے سے ان کی سادہ زندگی، دوستانہ رویہ، طنزیہ مزاج، خواتین کے بارے میں نرم گوشہ اور روزمرہ کے ہنگاموں میں شریک ہونے کی عادت کو بے ساختہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ تحریر نہ صرف ممتاز مفتی کو خراجِ تحسین ہے بل کہ ایک ایسے ادیب کا تصویری خاکہ بھی ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ قاری اور ساتھی اہل قلم کے دلوں میں اپنی شوخی، محبت اور تخلیقی توانائی کے باعث ہمیشہ زندہ رہا۔ یوں "منفرد اور ممتاز" کو صرف ایک دیباچہ کہنا کم ہوگا یہ دراصل ممتاز مفتی کی شخصیت اور فن کی دل نشین تصویریں ہیں جو ان کے فن کی ہمہ گیریت کا حقیقی اظہار ہیں۔

منشا یاد کی کتاب "منشایئے" میں شامل مضمون "اُردو فکشن کی ٹیڑھی لکیر" دراصل ایک یادگار نشست کی روداد ہے جو اکتوبر ۱۹۷۶ء میں حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد کے زیر اہتمام عصمت چغتائی کے اعزاز میں منعقد ہوئی۔ اس محفل میں اُردو ادب کی بڑی شخصیات شریک ہوئیں اور عصمت چغتائی کے فن، فکر اور شخصیت پر مختلف پہلوؤں سے اظہار خیال کیا گیا۔ صدرِ اجلاس قدرت اللہ شہاب اور شریکِ محفل جوش ملیح آبادی کی موجودگی نے اس شام کو تاریخی حیثیت بخشی۔ ممتاز مفتی، فتح محمد ملک، مظہر الاسلام اور اختر جمال جیسے اہلِ قلم نے عصمت کی تحریروں کو عورت کی بیداری اور سماج کے جمود کے

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

خلاف ایک بغاوت قرار دیا۔مظہر الاسلام نے ان کی زبان کو تیز مرچوں والے سالن سے تشبیہ دے کر ان کی کاٹ دار بیانیہ قوت کو واضح کیا جب کہ منصور قیصر نے انھیں ترقی پسند تحریک کا برگد کہا جس کے سائے میں قافلے ٹھہرے۔فتح محمد ملک نے ان کی شناخت کو جغرافیائی حدود سے بالاتر قرار دیا اور اپنی تہذیبی وراثت کا حصہ سمجھا۔اس سے یہ حقیقت ابھرتی ہے کہ عصمت کے فن نے محض عورت کے دکھ درد کو نہیں چھوا بل کہ برصغیر کی فکری اور تہذیبی صورت گری میں بھی اپنا کردار ادا کیا۔

اس شام کے مباحث نے یہ بھی ثابت کیا کہ عصمت چغتائی کا فن محض ایک ادبی مظہر نہیں تھا بل کہ اُردو فکشن کی فکری تاریخ کا موڑ تھا۔اختر جمال نے انھیں ادب کا سورج کہا جس نے عورت کو الگ ہستی کے طور پر منوایا۔محمد طفیل نے کہا کہ ان کی آمد نے ادب میں کھلبلی مچائی اور افسانے کو نئی زبان دی۔ممتاز مفتی نے اپنی یادداشتوں میں ان کی شوخی اور بے باکی کو یاد کیا اور اس نسل پر ان کے اثرات کا اعتراف کیا جس نے ان کے افسانے پڑھ کر اپنی شناخت تراشی۔خود عصمت چغتائی نے سوالات کے جوابات میں واضح کیا کہ بغاوت ان کے لیے کوئی منصوبہ بند عمل نہ تھی بل کہ عہد کی حقیقتوں سے پیدا ہوئی کیفیت تھی۔انھوں نے مارکسزم اور سوشلزم کو دنیا کا علاج قرار دیا اور علامت نگاری کو غیر مؤثر گردانا۔ان کی باتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ادب کو فلسفیانہ موشگافی سے بچا کر براہِ راست زندگی کے قریب رکھنا چاہتی تھیں۔اس نشست نے اُردو فکشن کے مستقبل پر بھی اعتماد بڑھایا جب عصمت نے نوجوانوں کی توانائی کو دیکھ کر کہا کہ افسانے کا مستقبل روشن ہے۔یوں یہ اجلاس نہ صرف عصمت کے فن کو خراجِ تحسین تھا بل کہ اُردو فکشن کی فکری اور موضوعاتی سمت کا تعین بھی۔

اسی طرح مضمون"آپ کا ضمیر" سید ضمیر جعفری کی شخصیت اور خدمات پر ایک ہمہ جہت روشنی ڈالتا ہے۔اس تحریر میں ان کے فن، کردار اور عوامی و ادبی سرگرمیوں کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ایک مکمل انسانی اور فکری خاکہ سامنے آتا ہے۔سید ضمیر جعفری کے تین شعری رنگ یعنی ملی شاعری، سنجیدہ غزل اور طنز و مزاح بطور خاص نمایاں ہیں۔ان کی مزاحیہ شاعری کو اُردو ادب میں "بابائے ظرافت" کے منصب تک پہنچنے کا اعزاز ملا اور یہ خصوصیت انھیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔ان کے کلام میں شگفتگی کے ساتھ وقار موجود ہے اور ان کی نثر بھی اسی خوبی سے مزین ہے۔ان کی شخصیت میں ایک تضاد بھی دکھائی دیتا ہے کہ وہ ذاتی طور پر ست الوجود تھے مگر قومی اور

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

فلاحی سرگرمیوں میں ہمیشہ آگے رہے۔مثال کے طور پر بھٹو دور کے سیلاب میں انھوں نے ربیعہ فخری اور سلطان رشک جیسے رفقا کے ساتھ مل کر متاثرین کے لیے کتب و سامان کی مہم چلائی۔ان کی ادبی خدمات محض تخلیقی سطح تک محدود نہ رہیں بل کہ عملی طور پر بھی انھوں نے ادبی اداروں کے قیام اور فروغ میں کردار ادا کیا۔اقبال ہال میں حلقہ ارباب ذوق کے لیے کمرہ مخصوص کرانے کی کوشش ہو یا بزمِ اکبر کے تحت طنز و مزاح کے فروغ کی کوشش یہ سب ان کی بصیرت اور عملی قوتِ ارادی کی مثالیں ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق کے لیے کمرہ مخصوص کرنے کے معاملے کو اپنے اس مضمون میں منشا یاد یوں بیان کرتے ہیں:

> ”جب اقبال ہال کی تعمیر کے نقشے بن رہے تھے میں نے ان سے کہا کہ اس میں ایک کمرہ حلقہ ارباب ذوق کی ہفتہ وار نشستوں کے لئے بھی ہونا چاہیے کہ اقبال پر ہم اہل ذوق کا بہت حق ہے۔انھیں یہ بات پسند آئی۔انھوں نے اسی وقت متعلقہ شعبے کو ٹیلی فون کیا اور کہا کہ اقبال ہال میں لائبریری، کنٹین اور ادبی میٹنگ کے لئے گنجائش رکھی جائے چناں چہ ایسا ہی ہوا۔اقبال ہال تعمیر ہو گیا تو ابتدا اس میں پریس کلب، لائبریری، تقریبات کے لئے مرکزی ہال اور حلقہ ارباب ذوق کی ہفتہ وار نشستوں کے لئے ایک بڑا کمرہ مخصوص تھا جس میں بیضوی شکل کی بڑی میز اور پچیس تیس کرسیاں بھی فراہم کر دی گئیں۔جب حلقہ ارباب ذوق اقبال ہال میں منتقل ہوا تو جعفری صاحب سی ڈی اے سے جا چکے تھے۔لیکن میں سمجھتا ہوں اس منتقلی کی بنیاد انھوں نے ہی رکھی تھی۔اس کمرے کو حلقہ ارباب ذوق کے لئے مخصوص کرنے کے لئے میرے نام (بطور سیکرٹری) با قاعدہ تحریری احکامات جاری ہوئے اور حلقہ کے ہفتہ وار اجلاس یہاں منعقد ہوتے رہے۔“ (۱۱)

مضمون کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ سید ضمیر جعفری کی شخصیت کو صرف ایک مزاح گو شاعر کے طور پر پیش نہیں کیا گیا بل کہ ان کی فکری گہرائی اور ادارتی بصیرت کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔وہ اسلام آباد کی ثقافتی تشکیل میں بھی شریک تھے جہاں آبپارہ، رمنا اور دامن کوہ جیسے نام تجویز

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

کرنے کا سہرا انھی کے سر ہے۔ان کے ساتھ جڑے واقعات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کی شگفتہ طبیعت کے باوجود وہ اصولوں اور اقدار پر سختی سے قائم رہتے تھے۔احمد فراز اور مولانا کوثر نیازی کے مشاعرے والا واقعہ ہو یا جہلم میں ان کی پذیرائی کا منظر ہر جگہ ان کی توقیر اور مقبولیت نمایاں ہے آخری عمر میں حافظے کی کمزوری اور بھولنے کی عادت کے باوجود وہ اپنے قاری اور ادبی رفقا کی محبت میں زندہ رہے۔ان کے خاکے اور مضامین اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ اپنے معاصرین کی خوبیوں کو اجاگر کرنے میں کمال رکھتے تھے۔عزیز ملک کو"حجرہ شاہ مقیم"، کرنل محمد خان کو "اُردوادب کا جنرل رومیل"، اور ادا جعفری کو "اُردوشاعری کی خاتونِ اول" کہنا ان کے تخلیقی ذوق اور محبت کی دلیل ہے۔یہ مضمون سید ضمیر جعفری کی شخصیت کو ایک ہمہ گیر ادبی، سماجی اور تہذیبی حوالہ بنا کر پیش کرتا ہے اور یہ تاثر دیتا ہے کہ وہ اُردو ادب میں محض ہنسی خوشی کے نمائندہ نہیں بل کہ ایک بڑے فکری و تہذیبی اثاثے تھے۔

اس باب میں شامل مضمون "ادب کا منگلا ڈیم"احمد ندیم قاسمی کی شخصیت اور ان کے ساتھ جڑی یادوں پر مبنی ہے جو ادبی تاریخ اور ذاتی مشاہدے دونوں کا حسین امتزاج پیش کرتا ہے۔اس تحریر میں احمد ندیم قاسمی کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں مثلاً ان کی خوش اخلاقی، شفیق رویہ اور نئے لکھنے والوں کی سرپرستی۔مضمون نگار کی پہلی ملاقات کا ذکر ہو یا شیخوپورہ سے جڑے دل چسپ واقعات، ان سب میں قاسمی صاحب کی یادداشت کی پختگی اور دوسروں کے دل میں جگہ بنانے کی صلاحیت واضح ہوتی ہے۔اسی طرح اسلام آباد کی سیر کے دوران ان کا ٹیکنیکل چیزوں میں دل چسپی لینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ صرف شاعر یا افسانہ نگار ہی نہیں بل کہ زندگی کے ہر پہلو پر گہری نظر رکھنے والے شخص تھے۔ فنون کے ذریعے نئے لکھنے والوں کی تخلیقات کو جگہ دینا اور اس پر حاسدین کی ناراضی مول لینا بھی ان کی وسعتِ قلبی اور ادبی ذمے داری کا ثبوت ہے۔ان کے تعلقات میں بے تکلفی اور اپنائیت جھلکتی ہے، خواہ وہ مظہر الاسلام اور کشور ناہید کے تعاون سے ہونے والی سالگرہ کی تقریب ہو یا امجد اسلام امجد اور عطا الحق قاسمی کے درمیان ہنسی مذاق کا منظر ہر جگہ وہ ایک شفیق باپ کی طرح نظر آتے ہیں۔

فکری طور پر منشایاد اس مضمون میں احمد ندیم قاسمی کے مقام کو محض ایک بڑے شاعر اور افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ انھیں اُردوادب کی ادارتی اور تنظیمی زندگی کا ستون بنا کر پیش کرتے ہیں۔غلام

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

رسول طارق کے واقعے میں ان کی بردباری اور حسنِ سلوک، ایوارڈز کے تنازعے میں ان کا شائستہ ردعمل اور اپنے مداحوں یا شاگردوں کو براہِ راست خط لکھ کر وضاحت طلب کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے دور کے صرف تخلیق کار ہی نہیں بل کہ ایک باوقار ادارہ بھی تھے۔ سید ضمیر جعفری نے انھیں ادب کا "منگلا ڈیم" کہا تھا اور یہ استعارہ اس مضمون میں بار بار سچ ہوتا محسوس ہوتا ہے، کیوں کہ ان کی شخصیت نے صرف تخلیقی توانائیوں کو یکجا نہیں کیا بل کہ آنے والی نسلوں کو بھی فیض پہنچایا۔ یہ تحریر احمد ندیم قاسمی کے ساتھ جڑی چھوٹی بڑی یادوں کے ذریعے یہ پیغام دیتی ہے کہ وہ ایک ایسے ادیب تھے جو ادب کو سماج، اداروں اور انسانی تعلقات سب کے ساتھ جوڑ کر دیکھتے تھے اور یہی ان کی عظمت کا اصل حوالہ ہے۔

مضمون "جوگی اتر پہاڑوں میں آیا" میں منشا یاد نے لطیف کاشمیری کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی ہے جسے ایک طرف ذاتی یادوں اور رفاقت کے حوالوں سے سجا کر پیش کیا گیا ہے تو دوسری طرف ان کی تخلیقی کاوشوں کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ ابتدا میں اخباری مضامین کے ذریعے پیدا ہونے والے اختلاف کا ذکر اور پھر مری میں ان سے ہونے والی قریبی رفاقت اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ ادبی تعلقات میں اختلاف کے باوجود ایک پائیدار رشتہ قائم ہو سکتا ہے۔ منشا یاد نے مری لٹریری سرکل کے پس منظر میں لطیف کاشمیری کی علمی و ادبی سرگرمیوں کو بیان کیا اور دکھایا کہ وہ کس طرح محفلوں کے روح رواں تھے۔ ساتھ ہی اس دوستی کو "مرنجان مرنج" شخصیت کی جھلک قرار دیا گیا ہے جس کے اثرات ان کے افسانوں اور نثری نظموں تک پہنچتے ہیں۔ منشا یاد اپنے اس مضمون میں لطیف کاشمیری کے ساتھ دوستی اور عملی و فکری یکسانیت کا احوال جس جامعیت سے پیش کرتے ہیں اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے بخوبی ہوتا ہے:

> "میرے اور لطیف کاشمیری میں کئی چیزیں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی تھیں۔ کہانی لکھنا، کتابیں پڑھنا، ادبی محفلوں کا انعقاد اور ان میں جوش و خروش سے حصہ لینا اور لنڈورے ہونے کے باوجود مری کی زندہ اور جیتی جاگتی خوب صورتیوں کی بجائے قدرتی خوبصورتیوں پر قناعت کرنا، شام کو مال روڈ پر گھومنے کی بجائے ہم دونوں لائبریری یا گھر پر افسانوں، کتابوں اور بحثوں میں الجھے رہتے۔" (۱۲)

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

فکری اور موضوعاتی سطح پر لطیف کا شمیری کی تخلیقات خصوصاً افسانوں کا جائزہ لیا گیا ہے جہاں طبقاتی شعور اور سماجی حقیقت پسندی نمایاں ہے۔ منشا یاد نے ان کے اہم کرداروں جیسے "رسل جو"، "ماما پرہیزا" اور "بابا حسن" کو نا قابلِ فراموش قرار دیا اور اس بات پر زور دیا کہ ان کے ذریعے سماج کے محروم طبقات کی حسرتیں اور کرب ابھرتے ہیں۔ یہی نہیں بل کہ ان کے افسانوں میں حقیقت اور رومان کا امتزاج، علامتی اظہار اور تہ دار معنویت انھیں ایک منفرد مقام عطا کرتے ہیں۔ مزید برآں کتاب "خیابان مری"(۱۳) کو صرف ایک تاریخی یا معلوماتی متن نہیں بل کہ تخلیقی رنگوں سے مزین ادبی حوالہ بتایا گیا جس میں مری کی تہذیبی، معاشرتی اور ادبی تاریخ کو محفوظ کیا گیا ہے۔ یہاں مولانا رشید اختر ندوی کے دیباچے اور ان کے تاریخی استناد کا ذکر بھی مضمون کو تحقیقی وزن دیتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ مضمون لطیف کا شمیری کی شخصیت، ان کی ادبی خدمات اور خطہ پوٹھوہار کی علمی روایت کو جوڑ کر پیش کرتا ہے جس سے ان کا مقام اور زیادہ واضح اور مستحکم نظر آتا ہے۔

اسی طرح مضمون "محبت کی مخمس" میں اعجاز راہی کی شخصیت اور خدمات کا ذکر محض تعزیتی نوٹ نہیں بل کہ ایک عہد کی ادبی اور فکری فضا کا آئینہ ہے۔ آغاز ہی میں مصنف نے اپنے والد کے دیہی و شہری ترجیحات کے تناظر میں اعجاز راہی کی موت اور اس کے بیٹے شکیل کی غیر موجودگی کا واقعہ سمو کر ایک تہذیبی المیہ پیش کیا ہے۔ یہ منظر اس بات کی علامت ہے کہ جدید زندگی کی ہجرتی کیفیت اور مغربی جلاوطنی کس طرح ہماری اجتماعی اقدار اور رشتوں میں فاصلے پیدا کر دیتی ہے۔ مضمون میں اعجاز راہی کی سادگی، محنت اور خود اعتمادی کو بار بار اجاگر کیا گیا ہے۔ وہ ایک سیلف میڈ شخص کے طور پر سامنے آتے ہیں جنھوں نے محنت اور عزم کے بل بوتے پر اپنی تعلیمی اور ادبی منزلیں طے کیں۔ ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ کبھی ماضی کے کسی احساسِ کم تری میں مبتلا نہ ہوئے بل کہ اپنی جدوجہد پر فخر کرتے رہے۔ ان کی دوستیوں کا حوالہ، رشید امجد کے ساتھ تعلق اور اس تعلق میں موجود رنج و شکوے بھی اس مضمون کا اہم حصہ ہیں جو ادیبوں کے باہمی رشتوں کی پیچیدگی کو سامنے لاتے ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق اور اسلام آباد کے ادبی ماحول میں ان کا کردار واضح ہوتا ہے کہ وہ محفلوں کے سرگرم رکن اور دوستوں کے حلقے میں محبت کی "مخمس" کا ایک مضبوط ضلع تھے۔

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

فکری سطح پر منشایاد اس مضمون میں اعجاز راہی کو صرف ایک تخلیق کار نہیں بل کہ ایک ہمہ جہت ادیب کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے تحقیقی اور تنقیدی کام کی وسعت، نوبل انعام یافتہ ادیبوں پر مطالعہ، اُردو افسانے میں علامت نگاری پر جامع کتاب اور زبان و ادب کے فنی مسائل پر تحقیقی تصانیف ان کے علمی مقام کو مستحکم کرتی ہیں۔ ساتھ ہی ان کی افسانہ نگاری، شاعری اور ناول نویسی بھی ان کی تخلیقی وسعت کا پتہ دیتی ہے۔ "تیسری ہجرت" جیسے افسانوی مجموعے اور "بے برکت دعائیں" جیسا شعری مجموعہ ان کے تخلیقی ذوق کی مثال ہیں۔ ان کی جرات کا پہلو بھی مضمون میں نمایاں ہے جب وہ فوجی آمریت کے زمانے میں "گواہی" جیسا مزاحمتی مجموعہ شائع کرنے سے نہیں ڈرے، حالاں کہ دوستوں کو اس پر خوف لاحق تھا۔ ان کی شخصیت اور حوصلے کا بہترین استعارہ ہے۔ یوں یہ مضمون نہ صرف ایک ادیب کی زندگی اور کاموں کا احاطہ کرتا ہے بل کہ ایک دور کے ادبی و فکری مزاج اور دوستوں کے باہمی رشتوں کی تہذیبی معنویت کو بھی آشکار کرتا ہے۔

"شہاب نامہ کی نثر" یہ مضمون دراصل قدرت اللہ شہاب کی خودنوشت "شہاب نامہ" کے فنی و فکری پہلوؤں پر ایک محققانہ تجزیہ ہے جس میں نثر کی ساخت اور اُسلوب پر خاص زور دیا گیا ہے۔ ابتدائی سطور میں پبلشر کے تعارفی نوٹ کا حوالہ دے کر یہ واضح کیا گیا ہے کہ کتاب میں سیاسی، تاریخی، دفتری، معاشرتی اور روحانی موضوعات کو یکجا کیا گیا ہے۔ لیکن اصل تنقیدی زاویہ یہ ہے کہ اس خودنوشت کی سب سے بڑی خوبی محض مواد نہیں بل کہ شہاب کی نثر اور اُسلوب کا جادو ہے۔ مصنف نے اس بات پر زور دیا کہ شہاب نے مصنوعی اور ثقیل زبان سے اجتناب کیا اور سادہ مگر اثرانگیز جملوں میں وہ گہرائی پیدا کی جو افسانوی تکنیک کے قریب تر ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی رائے کا حوالہ دے کر شہاب کی بے ساختگی اور سادہ بیانی کو منٹو کے اُسلوب کے ساتھ تقابل میں پیش کیا گیا ہے۔ منشایاد اس کتاب کے بارے میں یہ تاثر قائم کرتے ہیں کہ واقعات کی کثرت اور کرداروں کی بھرمار کے باوجود شہاب نے انھیں اس انداز سے ترتیب دیا کہ کتاب غیر دل چسپ یا بوجھل نہیں ہوتی بل کہ ہر صفحے پر ایک نیا فکری نکتہ قاری کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ منشایاد کے بقول:

> "اگر اس کی خود نوشت میں مصنف کا خلوص اور فنی چابک دستی شامل نہ ہوتی تو واقعات کی بھر مار، خیالات کا انبار اور اشخاص یا کرداروں کا انبوہ اسے غیر دل

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

چسپ اور بو جھل کتاب بنا دیتا۔لیکن شہاب صاحب نے ایک اعلیٰ پایہ کے نثر نگار ہونے کا ثبوت دیا ہے اور تمام مواد کو نہایت سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔" (۱۴)

اپنے مضمون میں منشایاد اس بات پر زور دیتے ہیں کہ موضوعاتی اور فکری سطح پر "شہاب نامہ" محض ذاتی یادداشتوں کا مجموعہ نہیں بل کہ تاریخ اور سیاست کا آئینہ ہے۔اس میں انگریز دور، تقسیم ہند، نوکر شاہی کی من مانی، مارشل لاء کا جبر، کشمیر کی جدوجہد اور بین الاقوامی تعلقات کی پیچیدگیاں یکجا ہیں۔لیکن ساتھ ہی ذاتی، خاندانی اور روحانی واردات بھی اسی شدت سے پیش کی گئی ہیں۔شہاب نے اپنی گھڑ سواری کی مثال سے لے کر"ماں جی" اور "کملا کماری" جیسے افسانوی واقعات کو بھی اس انداز میں جوڑا کہ حقیقت اور فکشن کی سرحدیں مٹتی دکھائی دیتی ہیں۔نثر کی چوتھی بڑی خوبی اس میں شامل شگفتگی اور برجستہ ظرافت ہے جو گمبھیر ترین بیانیے کو بھی تازگی عطا کرتی ہے جیسے حکیم گوراندت لال کے روغن بادام والا قصہ۔یوں شہاب نامہ اس بات کی مثال بن جاتا ہے کہ ایک ادیب جب خودنوشت کو فن کارانہ چابکدستی کے ساتھ برتے تو وہ محض زندگی کا بیان نہیں بل کہ عہد کی فکری اور تہذیبی تاریخ بھی رقم کرتا ہے۔

اس کتاب کا تیسرا باب "خاکے اور جائزے" کے عنوان سے ہے۔ مجموعی طور پر اس باب میں گیارہ خاکے شامل ہیں۔اس باب میں پہلا خاکہ "باتوں سے خوشبو آئے" ہے۔یہ خاکہ سید ضیا جالندھری کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کو خاکے اور تحقیقی تنقید کے امتزاج سے اجاگر کرتا ہے۔منشا یاد نے نہ صرف سید ضیا جالندھری کے ادبی سفر اور ذاتی زندگی پر روشنی ڈالی ہے بل کہ ان کی شاعری کو تاریخی اور جمالیاتی تناظر میں بھی دیکھا ہے۔ممتاز مفتی اور ابوالفضل صدیقی جیسے خاکہ نگاروں کا حوالہ دے کر انھوں نے یہ واضح کیا کہ سید ضیا جالندھری کا فن محض خوش گفتاری یا شخصیت کی دل کشی تک محدود نہیں بل کہ ان کی شاعری جدید اُردو نظم کے اہم ارتقائی موڑ کی نمائندہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ اختر عثمان نے ان کی نظم "بے مہار" کو پاکستان کے معاشرتی اور سیاسی تاریخ کے بیانیے کے طور پر دیکھا۔یوں سید ضیا جالندھری کی شاعری ایک طرف جمالیاتی صیقل اور تخلیقی مہارت کا مظہر ہے تو دوسری طرف قومی شعور اور سیاسی بصیرت کی حامل بھی ہے۔اس پہلو سے دیکھا جائے تو وہ محض ایک شاعر نہیں بل کہ اپنے عہد کے فکری اور سماجی سوالات کے گواہ اور ناقد ہیں۔فنی لحاظ سے دیکھا جائے تو اس خاکے میں منشایاد

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

نے شعوری طور پر جامعیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے کم سے کم الفاظ کا سہارا لے کر موضوع شخصیت کی زندگی کے ممکنہ حد تک تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ منشا یاد کے بقول:

> "دراصل میں صرف رسمی سا خاکہ نہیں لکھنا چاہ رہا تھا کیوں کہ یہ تو کسی شخصیت کی آؤٹ لائنز ہوتی ہیں اور میں محض آؤٹ لائنز یا نقشہ بنانا نہیں چاہتا، شان دار عمارت تعمیر کرنے کی خواہش رکھتا تھا مگر کوشش کے باوجود اب تک کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔"(۱۵)

دوسری جانب خاکے میں سید ضیا جالندھری کی شخصیت کے روزمرہ پہلو بھی نمایاں ہیں جن میں ان کی دیانت داری، اصول پسندی اور انسان دوستی شامل ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی انتظامی زندگی ہو یا ذاتی روابط، ان کی سادگی اور شرافت نے انھیں منفرد مقام عطا کیا۔ منشا یاد نے خاکہ نگاری کے اُصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بھی واضح کیا کہ ضیا جالندھری کی شخصیت کو پوری طرح گرفت میں لینا آسان نہیں کیوں کہ وہ ادب اور زندگی دونوں میں ایک وقار اور رکھ رکھاؤ رکھتے ہیں۔ یہی توازن ان کی شاعری میں بھی جھلکتا ہے جہاں وہ ایک طرف جدید نظم کے فنی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں اور دوسری طرف قومی و اجتماعی زندگی کے دکھ درد اور تضادات کو اظہار میں ڈھالتے ہیں۔ یوں یہ خاکہ سید ضیا جالندھری کے فن اور شخصیت دونوں کو اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ وہ محض ایک شاعر نہیں بل کہ اُردو ادب اور پاکستانی معاشرے کی فکری تاریخ کے اہم کردار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

دوسرا خاکہ "خوشبو کی طرح پذیرائی" ملک مقبول احمد کے حوالے سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خاکہ محض تاثراتی تحریر نہیں بل کہ اُردو اشاعتی دنیا کی فکری و سماجی معنویت کا آئینہ ہے۔ اس میں سب سے نمایاں پہلو ناشر اور مصنف کے تعلقات کا وہ زاویہ ہے جو ہمارے معاشرتی رویوں میں شاذ و نادر ہی دکھائی دیتا ہے۔ وہ محض کاروباری شخص نہیں بل کہ کتاب اور ادیب کی عزت کرنے والے ایک اصول پسند اور نیک دل انسان ہیں۔ اسی طرح محشر بدایونی کی کتاب فصل فردا کی طباعت کے بارے میں داد و تحسین یا حمید کاشمیری کی اس وضع داری پر حیرت کہ منی آرڈر واپس بھیج دیا گیا ان سب مثالوں سے ملک مقبول احمد کا وہ کردار ابھرتا ہے جو اُردو اشاعتی روایت میں خلوص، دیانت اور ادب دوستی کی علامت کے طور پر محفوظ ہو گیا ہے۔

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

اس خاکے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فکری سطح پر ملک مقبول احمد کی تصنیف "سفر جاری ہے "کو محض ایک خودنوشت یا ذاتی داستان قرار دینا ناانصافی ہوگی کیوں کہ یہ کتاب اُردو کے ادبی اور اشاعتی منظرنامے کی اجتماعی یادداشت ہے۔ اس میں دیہاتی زندگی کے مناظر، بارش کے دنوں کی تصویریں اور اشاعتی تجربات کے ساتھ ساتھ ادیبوں، شاعروں اور محققین سے تعلقات کی جھلکیاں بھی شامل ہیں۔ منشا د اپنے اس خاکے کی وساطت سے یہ وضاحت کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صفدر محمود نے اسے ایک ادبی دستاویز کہا، ڈاکٹر انور سدید نے اسے اسلام پسند ناشر کی پہچان قرار دیا اور امجد اسلام امجد نے اسے اپنے عہد کی ادبی فضا کا منظرنامہ بتایا۔ وزیر آغا کی رائے کہ یہ کتاب ایک ناشر کی آپ بیتی کے ساتھ ساتھ نشر و اشاعت کے بازار کی کروٹوں کو بھی ظاہر کرتی ہے اس کی اصل معنویت کو واضح کرتی ہے۔ اس کے ساتھ مصنف کی وہ سطور بھی اہم ہیں جہاں وہ اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی کتاب کے داخلی جمال کو مٹی کے خوش بو دار ہونے کی مانند اپنی تربیت قرار دیتے ہیں۔ یوں سفر جاری ہے اور اس پر لکھی گئی پذیرائی دراصل ایک ایسے ناشر کی فکری اور اخلاقی قدروں کی عکاسی ہے جس نے اُردو ادب میں کتاب کو محض کاروباری شے نہیں بل کہ روحانی اور تہذیبی امانت سمجھا۔ منشایاد نے اس خاکے میں یہ وصف بھی پیدا کیا ہے کہ اسے صرف ذاتی تاثرات تک محدود نہیں رکھا بل کہ دیگر لوگوں کی آرا اور مشاہدے کو بھی اہمیت دی ہے۔ بقول منور امین:

> "ان تحریروں کی خاص بات یہ ہے کہ منشایاد نے ایک شخصیت پر لکھتے ہوئے اپنے تاثرات کے ساتھ ساتھ اس شخصیت پر لکھے ہوئے دوسرے لوگوں کے لکھے ہوئے تاثرات بھی شامل مضمون کر لیے ہیں۔" (۱۶)

اسی طرح منشایاد نے " عالم چنا شہر ادب کا "میں اکبر حمیدی کی شخصیت اور فن کو جس سلیقے سے پیش کیا گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ محض شاعر یا انشائیہ نگار نہیں بل کہ ایک خاص ذہنی اور فکری رویے کے حامل ادیب ہیں۔ ان کی شخصیت کی تمثیل کبڈی کے کھلاڑی سے دی گئی ہے جو نہ زیر کرنا چاہتا ہے نہ زیر ہونا چاہتا ہے بل کہ اپنی باری پر کھیل کر دوسروں کو بھی کھیلنے کا موقع دیتا ہے۔ یہی رویہ ان کی زندگی اور ادب دونوں میں جھلکتا ہے۔ ان کے انشائیوں میں جگہ جگہ ایسے جملے اور مقولے بکھرے ہیں جو زندگی اور کائنات کے بارے میں نئے زاویوں سے سوچنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ ان

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

کے ہاں یہ اقوال زریں محض زبان کی بازی گری نہیں بل کہ مشاہدے اور تجربے کی گہرائی کا اظہار ہیں۔ مضمون میں یہ پہلو بھی نمایاں ہے کہ حمیدی محفلوں اور نجی گفت گو میں بھی ایسی باتیں کرتے ہیں جن سے قاری یا سامع کے ذہن میں فوری طور پر بصیرت اور تازگی پیدا ہوتی ہے۔اس طرح وہ ادبی تخلیق کے ساتھ ساتھ ذاتی رویے اور گفتار میں بھی ایک فکری اور جمالیاتی تہذیب کے نمائندہ ہیں۔

منشایاد کی اس تحریری کاوش کے نتیجے میں فکری سطح پر اکبر حمیدی کی شخصیت کا جو خاکہ سامنے آتا ہے وہ ایک ایسے ادیب کا ہے جو روایت اور جدید زندگی کے بیچ ایک انفرادی راستا تلاش کرتا ہے۔وہ دوستی، محبت اور رشتوں کو قبائلی اخلاص کے ساتھ برتتے ہیں مگر شہروں کی سیاسی اور ادبی پیچیدگیوں میں اپنی جگہ بنانے کے لیے خود کو بھی ڈھالتے ہیں۔یہی ضد، سچائی اور اصول پسندی ان کی شخصیت کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے اگرچہ اس سے بعض اوقات انھیں مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ مضمون میں گوجرانوالہ اور شیخوپورہ کے ادبی مکالمے کا ذکر اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کی شخصیت محض فردی نہیں بل کہ ایک وسیع تہذیبی تناظر میں جڑی ہوئی ہے۔ان کی شاعری میں وہی بلند پروازی جھلکتی ہے جو ان کی نجی گفت گو میں حقیقت پسندی اور اصول پسندی کی صورت میں موجود ہے۔یوں اکبر حمیدی کا یہ خاکہ نہ صرف ایک فرد کی تصویر ہے بل کہ اُردوادب میں اس ذہنی اور اخلاقی روش کا بھی عکاس ہے جس میں فن اور زندگی ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح خاکہ "عداوت ہی سہی "دراصل وقار بن الٰہی کے خاکے کے پردے میں دوستی، دشمنی، رقابت اور ادبی رفاقت کے پیچیدہ رشتوں کی طنزیہ و مزاحیہ عکاسی ہے۔ابتدا ہی سے منشا یاد نے وقار کی شخصیت کو متضاد صفات کے امتزاج کے طور پر پیش کیا ہے جو بظاہر سنجیدہ اور اصول پسند ہیں لیکن نجی محفل میں قہقہوں اور لطائف کا خزانہ کھول دیتے ہیں۔ان کی ضدی طبیعت، الٹی سیدھی گفت گو اور ہر بات کا الٹ مطلب نکالنے کی عادت کو اس چابکدستی سے بیان کیا گیا ہے کہ ایک فرد کی عجیب و غریب شخصیت ایک عہد کے مزاج اور ادبی محفلوں کے رویے کی علامت بن جاتی ہے۔اس میں وقار بن الٰہی کے مختلف ناموں کا قصہ، ان کی کتابوں کی اشاعت کی ترتیب اور دوست کے تجربات کو اپنی کہانی میں ڈھال لینے کی چالاکی جیسے واقعات نہ صرف قاری کو محظوظ کرتے ہیں بل کہ یہ ظاہر کرتے

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

ہیں کہ ادیبوں کی باہمی رقابت میں بھی ایک تخلیقی توانائی موجود ہوتی ہے۔اس پس منظر میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "شروع میں وہ بھی میری اور رشید امجد کی طرح سیدھی سادی بیانیہ انداز کی کہانیاں لکھتے تھے مگر جب میری کہانیاں چھوٹے نیم ادبی پرچوں میں چھپ رہی تھیں، انھوں نے "نقوش" اور "بیسویں صدی" وغیرہ میں چھپ کر ہمیں پریشان اور قارئین کو حیران کرنا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے "خالق"، "اکیلا"، "ساربان"، "اپنا گھر اپنی آگ" اور "پرایا دوزخی" جیسی مضبوط اور یادگار کہانیاں لکھیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ انھوں نے "یہ عالم شوق کا"، "سانپ کی موت"، "بٹوارہ"، "دیسی صابن کی بو" اور "نئی زندگی" جیسی تہ دار تمثیلی اور علامتی انداز کی کہانیاں لکھ کر ہمارا منہ چڑانا شروع کر دیا لیکن کاش وہ چند ایسی کہانیاں نہ لکھتے کہ میں ان کا جانی دشمن بننے پر مجبور ہو جاتا۔" (۱۷)

فکری سطح پر یہ خاکہ ادب میں شخصی رشتوں اور ادبی حسد کی ان باریکیوں کو آشکار کرتا ہے جو اکثر تخلیق کا ایندھن بنتی ہیں۔ وقار بن الٰہی کا کردار یہاں محض ایک فرد نہیں بل کہ اُردو ادبی دنیا کے اس مزاج کا نمائندہ ہے جہاں شہرت اور پذیرائی کی دوڑ میں دوست بھی رقیب اور رقیب بھی دوست بن جاتے ہیں۔ان کی تخلیق "اترنا دریا میں "کا ذکر اور اس پر منشا یاد کی شدید طنزیہ و حسد آمیز ردعمل دراصل اس بات کا ثبوت ہے کہ بہترین ادب وہی ہوتا ہے جو ذاتی تجربے اور رشتوں کے تنازع سے جنم لیتا ہے۔ یہ خاکہ اس پہلو کو بھی واضح کرتا ہے کہ ادبی محفلیں اور تقاریب اکثر مسابقت اور خودنمائی کا میدان بن جاتی ہیں جہاں تعریفیں اور تنقیدیں خالص ادبی معیار سے زیادہ باہمی تعلقات کی مرہون منت ہوتی ہیں۔یوں "عداوت ہی سہی" ایک خاکے سے بڑھ کر اُردو ادب کے سماجی و نفسیاتی پس منظر کی تخلیقی تصویر کشی ہے۔

اسی طرح "ہمدم دیرینہ "دراصل رشید امجد کے خاکے کے پردے میں ایک ایسی رفاقت کی کہانی ہے جو نصف صدی پر محیط ہے۔حافظ آباد کے برف فروشوں کی حکایت بطور استعارہ استعمال کر کے منشا یاد نے ادبی دنیا میں مقابلہ آرائی اور مسابقت کے رجحانات کی تصویر کھینچی ہے۔مگر یہ مقابلہ کسی تلخی یا کاروباری انہدام پر منتج نہیں ہوتا بل کہ ایک تخلیقی اور صحت مند کشاکش کی صورت میں جاری

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

رہتا ہے۔رشید امجد کے ساتھ دوستی اور اختلاف کے نشیب و فراز کو وہ اس ہنر مندی سے بیان کرتے ہیں کہ ذاتی تجربہ ادبی زندگی کے عمومی رویوں کی نمائندگی بن جاتا ہے۔ایک طرف وہ اس پر شکوہ کرتے ہیں کہ رشید امجد نے اپنی خود نوشت اور انٹرویوز میں اپنے ابتدائی دور کے حوالے سے ان کا ذکر دبے لفظوں میں یا مبالغے کے ساتھ کیا ہے اور بعض مقامات پر انھیں پینڈو یا مزاحیہ کردار کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے دوسری طرف وہ ان کی محبت اور رفاقت کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔منشایاد اپنی اور رشید امجد کی اس مقابلہ بازی کی فضا کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "میں اس کے افسانوں کو کچے اور جلدی گر جانے والے قرار دیتا اور وہ میرے افسانوں پر قصہ پن کی آلودگی کا الزام لگاتا۔" (۱۸)

رشید امجد کا یہ عکس اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ ادبی شخصیات کے باہمی تعلقات محض ذاتی رشتوں کا معاملہ نہیں بل کہ فن اور نظریے کے اختلافات سے بھی گہرے طور پر جڑے ہوتے ہیں۔ رشید امجد کے ہاں اختصاراور زبان کی شعری لطافت نمایاں ہے جب کہ منشا یاد اپنی دیہاتی وسعت، پھیلے ہوئے بیانیے اور کہانی پن کو ترجیح دیتے ہیں۔یہی فرق دونوں کو الگ الگ شناخت بخشتا ہے اور اسی فرق کی وجہ سے ان کے درمیان بظاہر مسابقت اور دراصل تخلیقی تکمیل کا عمل جاری رہتا ہے۔اس مضمون میں درج شادی کے واقعات، نثری نظموں اور سہرا خوانی کا ذکر نہ صرف مزاح پیدا کرتا ہے بل کہ اس بات کو بھی نمایاں کرتا ہے کہ ادیب محفل کے ہنگاموں اور دوستانہ چھیڑ چھاڑ سے اپنی تخلیقی توانائی کشید کرتے ہیں۔یوں ہمدم دیرینہ ایک شخصی خاکہ نہیں بل کہ اُردو ادب کی اجتماعی فضا، اس کے تضادات، رقابتوں اور دیرپا رفاقتوں کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

"کالم کاری کا جن "عطا الحق قاسمی کا خاکہ ہے۔یہ خاکہ درحقیقت اُردو ادب اور صحافت کی ایک نمایاں شخصیت عطا الحق قاسمی کے تخلیقی اور فکری جہان کا تحقیقی نقشہ پیش کرتا ہے۔مصنف نے ابتدا میں نسیم حجازی کے ساتھ ملاقات اور "دوستیوں کی چھانٹی" کے تصور کا حوالہ دے کر یہ مقدمہ قائم کیا ہے کہ وقت کے ساتھ رشتے پرکھے جاتے ہیں اور صرف پختہ دوستیاں باقی رہتی ہیں۔اسی تناظر میں عطا الحق قاسمی کو وہ دوست قرار دیا گیا ہے جو ہر آزمائش میں ثابت قدم رہے۔دل چسپ پہلو یہ ہے کہ یہ رفاقت ایک اختلافی خط سے شروع ہوئی اور پھر ادبی و صحافتی تعاون کی صورت میں آگے بڑھی۔احمد ندیم

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

قاسمی کی صدارت میں پہلی کتاب کی تقریبِ رونمائی کا اہتمام کیا، اور حتیٰ کہ امریکہ میں بھی ان کے اعزاز میں منعقدہ تقریب میں شریک ہوئے۔یہ واقعات اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ قاسمی صاحب کا کردار صرف دوست نوازی تک محدود نہیں بل کہ ادبی رفیقوں کی حوصلہ افزائی ان کی فطرت کا حصہ تھا۔

فکری سطح پر یہ خاکہ عطا الحق قاسمی کی کثیر الجہتی شخصیت کو سامنے لاتا ہے۔ان کے کالموں کی رنگا رنگی فکاہیہ، طنزیہ، سنجیدہ اور علامتی،ان کی ادبی بصیرت کی گہرائی کی غمازی کرتی ہے۔"ایک مردے سے ملاقات" جیسے کالم علامتی افسانے کی سطح پر پہنچ جاتے ہیں، جب کہ شوقِ آوارگی جیسا سفر نامہ ناول کی رنگا رنگی لیے ہوئے ہے۔عوامی کرداروں کو ڈرامہ سیریلز میں زندہ کرنا ہو یا "الہ دین کا جن" اور "غیر ملکی کا سرنامہ لاہور" جیسے سلسلے لکھنا، قاسمی صاحب نے مزاح کو محض قہقہہ نہیں بل کہ ایک تہ دار سماجی تنقید میں ڈھالا۔ان کی تحریروں میں دیہاتی سادگی، لاہوری مزاج اور عوامی زندگی کی دھڑکن صاف جھلکتی ہے۔ساتھ ہی "معاصر"جیسے معیاری جریدے کے اجرا سے ان کی ادبی تنظیمی صلاحیتیں بھی سامنے آتی ہیں۔یوں یہ خاکہ صرف ایک شخصی خراجِ تحسین نہیں بل کہ اُردو کالم نگاری اور طنز و مزاح کی روایت کا تحقیقی جائزہ ہے، جہاں ذاتی دوستی کے رنگ کے ساتھ ساتھ ادبی تاریخ کا ایک روشن باب بھی محفوظ ہو گیا ہے۔

منشایاد نے "آفاقیالوجی" کے عنوان سے اقبال آفاقی کے خاکے میں ایک طرف ان کی شخصیت کے تضادات اور نرالی عادات کو مزاحیہ پیرائے میں پیش کیا گیا ہے تو دوسری طرف ان کی علمی وجاہت اور فکری مقام کو اجاگر کیا گیا ہے۔ان کی ڈرائیونگ نہ سیکھنے کی عادت کو ممتاز مفتی کے سکوٹر سے تشبیہ دے کر مصنف نے ان کے اندرونی فلسفیانہ انہماک کو نمایاں کیا ہے۔حادثے کی تمثیل کے ذریعے یہ پہلو اُجاگر ہوتا ہے کہ ان کی زندگی ہمیشہ قضا و قدر کے تصورات اور موت و حیات کے سوالات کے گرد گھومتی رہی۔یہی رویہ ان کی علمی اور تنقیدی روش میں بھی جھلکتا ہے جہاں وہ بے لاگ تنقید کرتے ہوئے دوسروں کو فکری تصادم پر مجبور کر دیتے ہیں۔حلقہ ارباب ذوق کے الیکشنز میں ان کی بار بار کی شرکت، سخت سوالات اور نکتہ چینی اس بات کی دلیل ہیں کہ ان کے نزدیک فکری مکالمہ محض رسمی گفت گو نہیں بل کہ ایک فکری معرکہ تھا۔ان کی تصادم پسندی کا تعلق انا یا تکبر سے نہیں بل کہ اس

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

احساسِ محرومی سے جو بچپن ہی میں باپ کے سایہ نہ ہونے کے سبب ان کی شخصیت میں در آیا۔ یہ پہلو نہ صرف ان کی شخصیت کی نفسیاتی گرہیں کھولتا ہے بل کہ ان کی علمی مزاحمت کی جڑوں کو بھی واضح کرتا ہے۔ اس پس منظر میں مذکورہ خاکے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "ٹکرا جانا اور ٹکر مار دینا اقبال آفاقی کی شخصیت کی بنیادی خصوصیت ہے۔ سڑک ہو یا حلقہ ارباب ذوق کی علمی، ادبی یا نظریاتی بحث، دوسرے لاکھ بچنے کی کوشش کریں، ان کی کسی نہ کسی سے ٹکر ضرور ہو جائے گی۔" (۱۹)

ان کی فکری جدوجہد اور علمی کام اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ انھوں نے زندگی کی محرومیوں کو شکست تسلیم نہیں کی بل کہ علم کو اپنی طاقت بنایا۔ زمیندار کالج سے، پنجاب یونیورسٹی تک کا سفر اور وہاں سے فلسفے میں نمایاں مقام حاصل کرنا ان کی غیر معمولی صلاحیت کا اظہار ہے۔ کتاب معنی کے پھیلتے آفاق اور مسلم فلسفہ پر ان کا کام ان کے فکری دائرے کی وسعت اور علمی گہرائی کو ثابت کرتا ہے۔ اس کے علاوہ رسالہ "اوراق" کے اداریوں کی تدوین اور تفصیلی مقدمہ ان کے تحقیقی ذوق اور تنقیدی باریک بینی کا مظہر ہے۔ اقبال آفاقی نے افسانے کی تنقید میں نئی اصطلاحات اور تصورات متعارف کرائے اور اپنی مخصوص لفظیات کے ذریعے ایک جداگانہ شناخت قائم کی، یہاں تک کہ مصنف نے انھیں مزاحاً "اقبال آفاقیالوجی" کہا۔ یہ خاکہ ایک ایسے نقاد اور فلسفی کی تصویر پیش کرتا ہے جو فکری محاذ پر ہمیشہ سرگرم رہا، جس نے لفظ کی حرمت کو اپنی بنیاد بنایا اور اپنی علمی بصیرت سے ادبی اور تنقیدی روایت میں ایک مستقل حوالہ بن گیا۔

اسی طرح سلمان باسط کے خاکے "اسلام آباد میں واہ" میں مزاح اور طنز کے امتزاج کے ساتھ واہ اور اسلام آباد کے ادبی رویوں کا تقابلی جائزہ ملتا ہے۔ خاکہ نگار نے نہایت شگفتگی سے اس بات کو اجاگر کیا ہے کہ واہ کے ادیب تخلیق کو معیار کے ترازو میں تولتے ہیں جب کہ اسلام آباد میں ادیبوں کی قدر و منزلت زیادہ تر ان کے گریڈ اور عہدے سے منسلک ہے۔ اسی تناظر میں "خلوص کی چائے" اور "چھانٹی" جیسی تعبیرات نے نہ صرف سماجی روش پر طنز کیا بل کہ قاری کو ہنسنے پر بھی مجبور کیا۔ افتخار عارف کی صدارت کا ذکر، عثمان خاور کے خاکے بھائی جان کی تفصیل اور اس میں بیان کردہ واقعات

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

چاہے وہ فل بوائلڈ انڈہ پھنسنے کا منظر ہو یا ایئرپورٹ پر بیگ کی تلاشی سب نے اس خاکے کو زندگی سے بھرپور اور برجستہ رنگ عطا کیا ہے۔

خاکے کے دوسرے حصے میں سلمان باسط کے اسلوب، ان کی کتاب خاکی خاکے اور اس کی معنویت پر گفت گو کرتے ہوئے مصنف نے طنزیہ مزاح کو مزید گہرا کیا ہے۔"خاکی خاکے" کو "خا کا" اور "کا کی کا کے" جیسی ترکیبوں کے ساتھ جوڑ کر زبان کے کھیل کو تخلیقی سطح پر برتا گیا ہے۔روش ندیم کے بنائے ہوئے سرورق پر گردنوں کی زیادتی کا تذکرہ ہو یا سلمان باسط کی "کفایت شعاری" کے نتیجے میں "خاکچوں" پر مشتمل آئندہ کتاب کا تصور،یہ سب ادبی محفل کی روایتی سنجیدگی کو توڑ کر ایک زندہ دل اور دل چسپ فضا پیدا کرتے ہیں۔اس طرح یہ خاکہ نہ صرف ایک کتاب کی پذیرائی ہے بل کہ مزاحیہ تنقید کے ذریعے ہمارے ادبی رویوں اور سماجی تضادات پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔بقول منور امین:

> "منشایاد نے اس مضمون میں کتاب پر نہایت ہی شگفتہ انداز میں تنقید کی ہے۔کتابوں میں موجود خامیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ جسے پڑھ کر بے اختیار ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔" (۲۰)

حیدر قریشی کے خاکوں کا مجموعہ" میری محبتیں" فنی اور فکری سطح پر ایک نمایاں ادبی تجربہ ہے جس میں منشایادنے شخصی خاکہ نگاری کو یادوں کے ساتھ جوڑ کر ایک نئی جہت دی گئی ہے۔کتاب کے دو حصے،اول خویش اور بعد درویش،قریبی عزیزوں اور احباب پر مشتمل ہیں، جن میں مصنف نے نہ صرف ذاتی رشتوں کو موضوع بنایا بل کہ ان کی جزئیات اور انفرادیت کو بھی ابھارا ہے۔والدین کے خاکے برگد کا پیڑ اور ماں اے نی میں کنوں آکھاں ہوں یا دادا جی کا ذکر جس میں سخاوت کی ایک پر اثر روایت بیان ہوئی ہے، سب میں سچائی اور خلوص جھلکتا ہے۔اسی طرح فیض احمد فیض، ڈاکٹر وزیر آغا اور میرزا ادیب جیسے ادیبوں پر لکھے خاکے مصنف کی دیانت داری اور بصیرت کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ نہ مبالغہ کرتے ہیں نہ شخصیت پر اپنی مرضی کا رنگ چڑھاتے ہیں۔میرزا ادیب کی سادہ مزاجی کا بیان اور غلام جیلانی اصغر کے خاکے مزاحیہ برجستگی اور مشاہدے کی باریکی کی بہترین مثالیں ہیں۔

کتاب کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ حیدر قریشی نے خاکہ نگاری کو محض تفریح یا شگفتگی تک محدود نہیں رکھا بل کہ اس میں گہری فکری اور معنوی جہات کو بھی سمو دیا ہے۔بیٹے کے معصوم

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

سوال سے اخذ کردہ خدا کے تصور پر ان کی تفسیر ہو یا عالمی سیاست پر طنزیہ تبصرہ، یہ سب مصنف کی سنجیدہ فکری بصیرت کی غمازی کرتے ہیں۔ عنوانات کی معنویت جیسے مظلوم متشدد، زندگی کا تسلسل یا دوستی کا کمبل شخصیات کی کلید ثابت ہوتے ہیں اور مصنف کے تخلیقی ذوق کی گواہی دیتے ہیں۔ خاکہ نگاری میں سچائی کو بنیادی اصول مانتے ہوئے حیدر قریشی نے یہ واضح کر دیا ہے کہ اپنے قریبی لوگوں کے بارے میں لکھتے ہوئے دراصل انسان اپنا خاکہ بھی لکھتا ہے، اس لئے مبالغہ اور تصنع سے اجتناب لازمی ہے۔ یہی خلوص، سچائی اور شگفتہ طرز تحریر میری محبتیں کو نہ صرف ایک یادگار مجموعہ بناتے ہیں بل کہ اُردو خاکہ نگاری کے سلسلے میں ایک اہم سنگ میل بھی ثابت کرتے ہیں۔

"رنگ رنگ کے رنگ" میں محمد حمید شاہد کے افسانوی مجموعے "جنم جہنم" پر یہ تنقیدی تحریر اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ اُردو افسانے نے گزشتہ چار دہائیوں میں کس قدر نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ منشایاد نے ابتدا میں انتظار حسین کے استحکام کا حوالہ دے کر ساٹھ کی دہائی کے افسانوی تجربات کی ناکامی اور لفظی بازی گری کے غلبے پر روشنی ڈالی اور پھر اس امر پر زور دیا کہ ستر کی دہائی کے نوجوان افسانہ نگاروں نے اس فن کی ڈوبتی کشتی کو سہارا دیا۔ انھی ناموں میں محمد حمید شاہد کا ذکر نمایاں ہے جنھوں نے اپنی دوسری کتاب "جنم جہنم" کے ذریعے نہ صرف اپنے پہلے مجموعے کو زندہ رکھا بل کہ اپنی فکری اور فنی ترقی کا ثبوت بھی دیا۔ خاکے میں بالخصوص اس بات کو سراہا گیا ہے کہ وہ کسی ایک ڈکشن یا سانچے کے قیدی نہیں بل کہ ہر کہانی کے ساتھ اس کے موزوں اُسلوب اور تکنیک کو تلاش کرتے ہیں۔ اپنی تحریروں کے ذریعے منشایاد اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ ان کے افسانے تماش بین، پارو، مچھلی اور واپسی زمین سے جڑی ہوئی کہانیاں ہیں جو قارئین کے ذہن اور دل پر دیرپا اثر چھوڑتی ہیں۔

"وِرک کا وَرک" اشفاق احمد ورک کے حوالے سے یہ خاکہ مزاحیہ جملوں یا شگفتہ واقعات کا تذکرہ ہے اور اُردو طنز و مزاح کے ایک ایسے نئے لہجے کی شناخت ہے جو روایتی مزاح نگاری کو تازگی اور انفرادیت بخشتا ہے۔ تحریر کا ابتدائی حصہ گوجرانوالہ اور شیخوپورہ کی برتری کے ہلکے پھلکے مکالمے سے شروع ہوتا ہے مگر جلد ہی یہ ذاتی حوالہ ایک وسیع تر ادبی تناظر میں بدل جاتا ہے جہاں مشتاق احمد یوسفی، محمد خالد اختر، عطا الحق قاسمی اور محمد یونس بٹ جیسے بڑے نام پس منظر میں آتے ہیں اور اشفاق احمد ورک کا مقام ایک نئے اور جواں سال مزاح نگار کے طور پر متعین کیا جاتا ہے۔ ان کی پہلی

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

کتاب "قلمی دشمنی" اور پھر دوسری کتاب " ذاتیات" کو بطور حوالہ پیش کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض وقتی مسکراہٹیں نہیں بکھیرتے بل کہ طنز و مزاح کے سارے قرینوں اور حربوں پر گہری گرفت رکھتے ہیں۔ان کے کردار حکیم تھے اور مسٹر لو ہوں یا خاکوں میں شامل جمیل احمد اور سجاد باقر رضوی جیسے نام سب ان کی شگفتہ نکتہ آفرینی کے آئینے میں نئے روپ کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

وہ پیروڈی اور تحریف میں کمال رکھتے ہیں اور محض زیر زبر یا ایک لفظ کی تبدیلی سے معنی کی نئی دنیا آباد کر دیتے ہیں۔یہی اُسلوب انھیں مشتاق احمد یوسفی کے بعد کے بڑے طنز نگاروں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ان کے جملے کہاوتوں اور مقولوں کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ان کی تحریروں میں نہ صرف سماجی رویوں اور کرداروں کی کجی بے نقاب ہوتی ہے بل کہ قاری کے اندر سوچنے اور مسکرانے کا ایک ساتھ رجحان پیدا ہوتا ہے۔یہی توازن اور تہ داری انھیں سطحی مزاح سے ممتاز کرتی ہے۔آخر میں مصنف نے اشفاق احمد ورک کو اپنے علاقے کا "ادبی ہرن مینار" قرار دے کر اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ ان ک ان کی تخلیقی قامت کسی ایک شہر کی حدود سے بڑھ کر اُردو طنز و مزاح کے بڑے منظرنامے میں اہم مقام رکھتی ہے۔اس پس منظر میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "اشفاق محض ہنساتے ، گد گداتے ہی نہیں اور نہ ہی صرف افراد اور سوسائٹی کی کج رویوں کی نشان دہی کرتے ہیں وہ نکتہ چینی ہی نہیں نکتہ آفرینی بھی کرتے ہیں اور زندگی کے حقائق معاملات اور مسائل کو سمجھنے میں قاری کی مدد بھی کرتے ہیں۔ان کے بعض جملے کہاوتوں اور مقولوں کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔یہی دانشورانہ نکتہ آفرینی انھیں تخلیقی عظمت عطا کرتی اور اعلیٰ ادب سے ان کا رشتہ استوار کرتی ہے۔" (۲۱)

"منشایئے" کا چوتھا باب "کلام نرم و نازک" کے عنوان سے ہے۔یہ دراصل مختلف ادبا کے کلام پر منشایاد کے تبصروں کا مجموعہ ہے۔اس باب میں ان کا پہلا تبصرہ احمد فراز کی شاعری پہ ہے۔منشایاد نے اس مضمون کے عنوان ہی میں احمد فراز کو "شاعر خوش کلام" قرار دیا ہے۔حقیقی طور دیکھا جائے تو منشا یاد کا یہ مضمون "شاعر خوش کلام" محض احمد فراز کی یادوں کا مجموعہ نہیں بل کہ ایک ادبی اور تہذیبی عہد کی جھلک بھی ہے جس میں فراز کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے مختلف پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔اس تحریر میں احمد فراز کی

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

شہرت و مقبولیت کو صرف ان کے شعری کمال تک محدود نہیں رکھا گیا بل کہ ان کی سماجی اور سیاسی وابستگیوں کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔اقتدار کے جبر کے خلاف ان کی مزاحمت اور عوامی مسائل پر ان کی آواز کو مصنف نے بار بار یاد دلایا ہے۔

فراز کی شخصیت کو ایک شریر اور بذلہ سنج انسان کے طور پر بھی پیش کیا گیا ہے جو محفلوں کو زندہ رکھنے کا ہنر جانتا تھا اور سنجیدگی کو اپنے برجستہ جملوں سے توڑ کر خوش گوار فضا پیدا کر دیتا تھا۔ مضمون میں ان کے دوستانہ تعلقات کے ساتھ ساتھ اختلافات اور خفگیوں کی جھلک بھی ملتی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فراز کا مزاج نرم خو بھی تھا اور اصولی رویوں میں سختی بھی رکھتا تھا۔بقول منشایاد:

> "احمد فراز کی پاکستان سے محبت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ فیض صاحب کی طرح وہ بیرون ملک پاکستان کی پہچان تھے اور دیگر ممالک خصوصی طور پر انڈیا میں ایک طرح کے پاکستان کے سفارت کار تھے۔"(۲۲)

اسی طرح مضمون "سبحان تیری قدرت" میں سید بین قدرت کی شاعری اور اُسلوب پر منشایاد نے ایک ایسے انداز میں روشنی ڈالی ہے جو تعریف تک محدود نہیں بل کہ باریک بینی سے ان کی فنی خوبیوں اور خامیوں دونوں کا احاطہ کرتا ہے۔ تحریر میں ان کی غزلوں کی روانی اور لفظوں کی فراوانی کو ایک بہتے دریا سے تشبیہ دی گئی ہے جو اپنی روانی میں کہیں دل کش موتی بکھیرتا ہے تو کہیں خس و خاشاک بھی ساتھ لے آتا ہے۔شاعر کے ہاں بعض غزلوں میں فکری تازگی اور معنوی وسعت ملتی ہے مگر اسی کے ساتھ کمزور اور بے ربط اشعار بھی نظر آتے ہیں جو مجموعی حسن کو دھندلا دیتے ہیں۔کتابت کی غلطیوں، زبان کے بعض غیر مناسب استعمال اور مفہوم کی پیچیدگیوں کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ منشا یاد نے مطالعہ محض سرسری انداز میں نہیں بل کہ پوری تنقیدی شعور کے ساتھ کیا ہے۔مضمون میں ظرافت بھی جھلکتی ہے جہاں کمزور اشعار کو خوش گوار طنز کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور کہیں کہیں اس رویے نے تنقید کو بوجھل ہونے سے بچا لیا ہے۔اس تحریر کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ شاعر کے سیاسی اور سماجی شعور کو اجاگر کیا گیا ہے اور ان کی ترقی پسندانہ فکر کو سراہا گیا ہے جو اشعار میں روشنی کی کرن کی طرح ابھرتی ہے۔ساتھ ہی تخلص کے بار بار استعمال پر دل چسپ تبصرہ تحریر کو مزید جان دار بنا دیتا ہے۔یوں یہ مضمون محض ایک شاعر کے کلام پر رائے نہیں بل کہ ادب میں حسن و

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

قباحت کے امتزاج کو پرکھنے کی ایک مثال ہے جس سے تنقیدی شعور اور فنی باریک بینی کی جھلک نمایاں طور پر سامنے آتی ہے۔

اسی طرح "نرم دم گفت گو" میں انوار فیروز کی شخصیت اور شاعری کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے وہ ایک طرف ان کی نجی زندگی کی سادہ لوحی اور محبت بھرے رویے کو اجاگر کرتا ہے اور دوسری طرف ان کی شاعری کے مزاحمتی اور جمالیاتی پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے۔منشا یاد نے انوار فیروز کو ایک ایسے شاعر اور صحافی کے طور پر دکھایا ہے جو نرم خوئی، حلیمی اور بے تکلف مزاج رکھتے ہیں مگر ان کے فن میں داخلی قوت اور خارجی حقیقتوں کا جرات مندانہ اظہار موجود ہے۔مضمون میں اس پہلو پر زور دیا گیا ہے کہ فیروز کی شاعری میں سہل ممتنع کی کیفیت ہے یعنی الفاظ سادہ اور روزمرہ سے قریب ہیں لیکن ان میں تہ دار معنویت اور فکری گہرائی چھپی ہوئی ہے۔

ان کے ہاں بستی کا استعارہ معاشرتی اور سیاسی حالات کے استبداد اور جبر کی نشان دہی کرتا ہے اور ان کی نظم و غزل دونوں میں ظلم، محرومی اور سامراجی تسلط کے خلاف ایک توانا آواز سنائی دیتی ہے۔ساتھ ہی ان کے رومانی اور شخصی تجربات کو بھی نہایت سلیقے اور سادگی سے بیان کیا گیا ہے جس سے ان کے فن میں توازن اور وسعت پیدا ہو گئی ہے۔روشنی اور اجالے کی علامتوں کو بار بار برتنے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ شاعر کا جھکاؤ امید، امن اور مستقبل کی روشن تمناؤں کی طرف ہے۔منشا یاد نے اپنے مخصوص دل نشین اُسلوب میں انوار فیروز کی شخصیت کو محبت اور احترام کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان کی شاعری کی قوت کو اس طرح اجاگر کیا ہے کہ قاری پر شاعر کی انسان دوستی، سماجی شعور اور تخلیقی توانائی کے تمام پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں۔یوں یہ مضمون صرف ایک شخصی خاکہ نہیں بل کہ ایک ایسے فن کار کی فکری و فنی جہات کا جامع تعارف ہے جو نرم دم گفت گو ہونے کے باوجود اپنے عہد کی بڑی صداقتوں کو بلند آواز میں بیان کرتا ہے۔اسی طرح ان کی شخصیت میں خاموشی طبعی بہت حد تک نمایاں ہے۔بقول منشایاد:

> "انور فیروز شاعری کریں، رپورٹنگ کریں یا کسی دوست کی کتاب پر تبصرہ لکھیں، وہ سارے کام چپکے چپکے کرنے کے عادی ہیں۔ کوئی شور نہیں کوئی دعوی نہیں، کسی پر کوئی احسان نہیں۔ان کا یہی خلوص احباب کو بھاتا اور ان کی محبت کا اسیر رکھتا ہے۔" (۲۳)

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

اسی طرح "ہوا سے بات" میں احسان اکبر کی شخصیت اور شاعری کو جس بصیرت اور محبت سے پیش کیا گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ محض ایک شاعر نہیں بل کہ ایک عہد کے تخلیقی اور فکری نمائندہ ہیں۔ منشا یاد نے ابتدا میں ایک مشاعرے کا واقعہ بیان کر کے شاعر کے حساس مزاج اور سنجیدہ تخلیق کے ساتھ ان کی وابستگی کو نمایاں کیا ہے اور اس کے بعد ان کی شاعری کے بنیادی استعارے "ہوا" کو مرکزی حیثیت دیتے ہوئے بتایا ہے کہ احسان اکبر نے اس علامت کے ذریعے زندگی، جدوجہد اور جمالیات کے مختلف رخ اجاگر کیے ہیں۔ ان کے ہاں زبان کی سطح پر ایک انوکھا تجربہ ملتا ہے جہاں اُردو کے ساتھ پنجابی، ہندی، فارسی اور عربی کے عناصر گھل مل کر ایک نئے ذائقے کو جنم دیتے ہیں اور یہ امتزاج ان کی شاعری کو مقامی اور عالمی دونوں حوالوں سے معنویت عطا کرتا ہے۔

"ایک اور ہیرا پھیری" میں منشا یاد نے سرفراز شاہد کے طنز و مزاح کو نہایت دل چسپ اور سنجیدہ تنقیدی نگاہ سے پرکھا ہے۔ ابتدا میں وہ انسانی زندگی کے دکھوں اور تلخیوں کے مقابلے میں مسکراہٹ اور قہقہے کی اہمیت اجاگر کرتے ہیں اور مزاح نگار کو اس سفر کا ہمسفر قرار دیتے ہیں جو اپنی شوخی اور حاضر دماغی سے کڑے موسم کو قابل برداشت بنا دیتا ہے۔ سرفراز شاہد کے ابتدائی دور میں طنز کی کاٹ اور چبھن زیادہ نمایاں تھی لیکن رفتہ رفتہ ان کی شاعری میں مزاح اور طنز کے درمیان ایک متوازن آہنگ پیدا ہو گیا اور فن اور مقصد ایک دوسرے میں گھل مل گئے۔ منشا یاد نے ان کے مختلف شعری حربوں پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ زبان و بیان کی چابک دستی، صورتِ واقعہ کے الٹ پھیر، مزاحیہ کردار کی تخلیق اور پیروڈی جیسے طریقوں میں غیر معمولی مہارت رکھتے ہیں۔

وہ غالب اور اقبال جیسے بڑے شعرا کی زمینوں میں بھی شوخی سے اپنے رنگ بکھیرتے ہیں مگر ان کے ہاں یہ رویہ استہزا یا تحقیر میں نہیں ڈھلتا بل کہ محض تخلیقی خوش ذوقی کی شکل اختیار کرتا ہے۔ معاشرتی زندگی کے تقریباً ہر گوشے پر ان کی نظر ہے اور وہ استاد، افسر، سوداگر، عاشق یا ریاکار واعظ سب کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں لیکن ان کے ہاں کسی کو ذلیل کرنے یا برتر دکھانے کا رویہ نہیں ملتا بل کہ طنز کے پیچھے ایک دردمند دل اور سماج کو بہتر بنانے کی خواہش کارفرما ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں کردار نگاری کا کمال، لفظوں کی ہیرا پھیری کی دل کشی اور موقع محل کے مطابق مزاح پیدا کرنے کی قدرت اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ محض خوش طبع شاعر نہیں بل کہ ایک باشعور فن کار ہیں

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

جنھوں نے طنز و مزاح کو محض تفننِ طبع کے لیے نہیں برتا بل کہ اسے معاشرتی صداقتوں کے اظہار اور اصلاح کے موثر وسیلے میں ڈھال دیا۔

"ثاقبہ کے جی کا نور" میں منشا یاد نے ثاقبہ رحیم الدین کے شعری مجموعے کا جائزہ نہایت برجستگی اور خوش طبعی کے ساتھ لیا ہے۔وہ ابتدا میں خود کو تائب شاعر قرار دے کر اپنی ادبی بصیرت کا اعتراف کرتے ہیں اور اسی موقع پر قاری کو یہ باور کراتے ہیں کہ ان کی نظر میں شاعری محض نثری خیالات کو نظم میں ڈھالنے کا عمل نہیں بل کہ ایک تخلیقی واردات اور فنی اظہار ہے۔اس پس منظر میں وہ ثاقبہ کی کتاب کی انفرادیتوں کو نمایاں کرتے ہیں جن میں ہاتھ سے لکھی ہوئی شکل ہر نظم کا بسم اللہ سے آغاز، عنوانات کا غیر روایتی ہونا، سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال اور پیچیدہ استعارات سے گریز شامل ہیں۔منشا یاد کے نزدیک یہ خصوصیات ثاقبہ کے فن کو نہ صرف الگ شناخت دیتی ہیں بل کہ ان کی شخصیت کی سادگی اور پاکیزگی کا بھی پتا دیتی ہیں۔ان کی شاعری میں خدا اور رسول ﷺ سے عقیدت، والدین اور عزیزوں کے تذکرے کے ساتھ یتیموں، بے آسرا بچوں اور محروم طبقے کے لیے مامتا بھرا رویہ نمایاں ہے جو ان کی انسانی ہمدردی اور دردمندی کا اظہار ہے۔انھوں نے قافیہ پیمائی کو لازم نہیں سمجھا اور آزادانہ اُسلوب اپنایا لیکن فنی کم مائیگی کے بجائے اس رویے سے ان کے خلوص اور براہ راست اظہار کی کیفیت ابھرتی ہے۔ان کے ہاں نیچر کے حوالوں سے لکھی گئی نظمیں خاص طور پر نمایاں ہیں جہاں چڑیا، مینا، جگنو، بارش اور بچپن کی یادیں ایک معصوم اور دل نشین فضا قائم کرتی ہیں۔یہ وہی کہانی گوئی کی دنیا ہے جس سے ثاقبہ کی تخلیقی حس نے جنم لیا اور جسے انھوں نے شاعری میں نئی جہت دی۔ اس کا اظہار منشا یاد کے ان الفاظ سے بخوبی ہوتا ہے:

> "میں سمجھتا ہوں یہ وہی ان کے اندر کی کہانیوں والی ثاقبہ ہیں جو بچوں کو مدھم لے میں تیلیوں، میناؤں ، بلبلوں اور فاختاؤں کی دل چسپ کہانیاں سناتی تھیں۔ انھوں نے نثری اُسلوب کی بجائے شعری اُسلوب اختیار کیا ہے۔" (۲۴)

"ریگ دشت فراق"میں منشا یاد نے امجد اسلام امجد کی شخصیت اور فن کو جامع انداز میں پرکھا ہے۔ان کے نزدیک امجد کی کامیابی محض شاعری تک محدود نہیں بل کہ ان کی ذہانت اور تخلیقی صلاحیت نے انھیں مترجم، ڈراما نگار اور شاعر کی حیثیت سے بھی ممتاز کیا ہے۔وہ اس بات پر زور دیتے

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

ہیں کہ امجد اسلام امجد جس فن کو بھی اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں اسے بلندی اور انفرادیت عطا کرتے ہیں۔ بطور مترجم ان کی فلسطینی اور افریقی نظموں کی پیشکش محض ترجمہ نہیں بل کہ تخلیق کے درجہ کو چھو لیتی ہے اور بطور ڈراما نگار وارث، دہلیز، سمندر اور رات جیسے کھیلوں نے اُردو ٹی وی ڈرامے کو ادبی وقار بخشا۔ امجد اسلام امجد کی شاعری کے حوالے سے منشا یاد انھیں محبت، حسن اور خیر کا شاعر قرار دیتے ہیں جو مجازی و حقیقی تقسیم سے بالاتر ہو کر انسانی جذبات کو تازگی اور شفافیت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ان کی لفظیات اور علامتیں مظاہرِ فطرت سے جڑی ہوئی ہیں جن کے ذریعے وہ اپنے تجربات اور وارداتوں کو استعاراتی انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کی غزل اور نظم کے درمیان فنی رچاؤ ایسا ہے کہ دونوں اصناف ایک دوسرے کو تقویت دیتی ہیں اور نظموں میں تغزل اور غزلوں میں وحدتِ تاثر قاری پر غیر معمولی اثر ڈالتی ہے۔ امجد کی امیجری، تازہ لفظیات اور استعاراتی قوت ان کے کلام کو نہ صرف دل کش بناتی ہے بل کہ اپنے عہد کی فکری اور جذباتی ضرورتوں کو بھی پورا کرتی ہے۔ منشا یاد نے اس جائزے میں امجد اسلام امجد کی تخلیقی ہمہ گیری، موضوعات کی وسعت اور فنی پختگی کو اجاگر کرتے ہوئے انھیں اپنے ہم عصروں میں نمایاں مقام دینے کا حق ادا کیا ہے اور یہ تاثر قائم کیا ہے کہ امجد کا تخلیقی سفر محض کامیابی کا نہیں بل کہ اُردو ادب کے لیے ایک مسلسل ثروت مند اضافہ ہے۔

"عرض ہنر سے کہیں آگئے" میں منشا یاد نے جلیل عالی کی شاعری اور شخصیت کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لیا ہے اور انھیں ایسے شاعر کے طور پر پیش کیا ہے جو کم لکھنے کے باوجود دیرپا اور معیاری اثر چھوڑتا ہے۔ وہ ان کی تخلیقی روش کو اس پہلے کاریگر سے تشبیہ دیتے ہیں جس کا کام وقت کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے اور جس کی محنت دیر تک برقرار رہتی ہے۔ جلیل عالی کی شاعری میں سلیقہ، شائستگی اور وقار نمایاں ہیں اور ان کی شخصیت کا وقار ان کے شعری اظہار میں بھی جھلکتا ہے۔ منشا یاد اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ایک اچھا شاعر محض فن کار نہیں بل کہ ایک بہتر انسان بھی ہونا چاہیے اور جلیل عالی اس معیار پر پورا اترتے ہیں۔ ان کی لفظیات اور ترکیبات جیسے خواب دریچہ، شوق ستارہ اور احساس پنچھی نے اُردو شاعری کو ایک نیا ذائقہ دیا اور اضافت سے آزادی کی ایک منفرد راہ متعارف کرائی۔

ان کی شاعری میں تہذیب و ثقافت سے جڑت کے ساتھ ساتھ جدت اور تازگی بھی موجود

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

ہے اور وہ صناعی کے بجائے خلوص اور صداقت کو اہمیت دیتے ہیں۔ جلیل عالی محض ذاتی واردات کے شاعر نہیں بل کہ سماجی جبر اور ناانصافی کے خلاف بھی آواز بلند کرتے ہیں اور شاعری کو ایک ذمہ داری کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ان کے تیسرے شعری مجموعے "عرض ہنر سے کہیں آگئے" کو منشا یاد تخلیقی رفتار، تازگی اور تنوع کے اعتبار سے نہ صرف اہم اضافہ قرار دیتے ہیں بل کہ اس میں نظموں اور غزلوں دونوں میں پختگی اور وسعت کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں ذاتی اور اجتماعی دونوں طرح کے موضوعات ملتے ہیں جن میں عالمی مسائل کی بازگشت بھی ہے اور ذاتی جذبات کی گہرائی بھی۔ یوں جلیل عالی ایک ایسے شاعر کے طور پر سامنے آتے ہیں جو روایت سے وابستہ رہتے ہوئے جدت اور فکری بالیدگی کے ذریعے اپنی منفرد شناخت قائم کرتے ہیں اور اُردو شاعری کو ایک نیا زاویہ عطا کرتے ہیں۔

"اظہار بھی مشکل ہے" میں منشا یاد نے محمد اظہار الحق کی شاعری اور شخصیت کا نہایت جامع اور گہرا تجزیہ پیش کیا ہے اور انھیں ایسے فن کار کے طور پر متعارف کرایا ہے جو روایت کے ساتھ جڑ کر بھی جدت کے نئے در وا کرتا ہے۔ ان کے چار شعری مجموعوں میں "دیوار آب"، "غدر"، "پری زاد" اور "پانی پر بچھا ہوا تخت" شامل ہیں جو ہر اعتبار سے فکری اور فنی ارتقا کی نمائندگی کرتے ہیں۔ منشا یاد یہ واضح کرتے ہیں کہ اظہار الحق کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ پامال راہوں پر چلنے کے بجائے اظہار کے لیے الگ خطہ اور تازہ اوزار تلاش کرتے ہیں اور علامتوں و استعاروں کے ذریعے اپنی شاعری کو ایک نیا مزاج عطا کرتے ہیں۔ وہ غزل کے روایتی سانچے میں بھی تبدیلی لانے کی جرات رکھتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر نثری نظم کا سہارا بھی لیتے ہیں۔ ان کے ہاں محض روایتی عشق و محبت کا بیان نہیں بل کہ مسلم تہذیب کی عظمت رفتہ کا نوحہ، انسانی قدروں کی بازیافت اور اپنی زمین سے گہری وابستگی نمایاں ہے۔

اسی طرح منشا یاد کے بقول محمد اظہار الحق دیار غیر کی مرعوبیت کے بجائے اپنی مٹی اور اس کے موسموں، کھیتوں، درختوں اور خوشبوؤں کو اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہیں اور ان مناظر کے ذریعے اپنی تہذیبی جڑوں سے جڑے رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ پانی پر بچھا ہوا تخت "میں انھوں نے تلمیحات کو جس انداز میں برتا ہے اس سے ان کی فکری گہرائی اور فنی باریک بینی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ امن، محبت اور عدل کے خواہاں ہیں اور ان کا کلام ایک ایسے خواب کی صورت سامنے آتا ہے جس میں استحصال سے پاک معاشرہ اور انصاف پر مبنی دنیا کی جھلک ملتی ہے۔ یوں منشا یاد کے تجزیے سے یہ بات سامنے

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

آتی ہے کہ محمد اظہار الحق اپنے اُسلوب اور فکر دونوں کے اعتبار سے اُردو شاعری میں ایک الگ اور معتبر شناخت رکھتے ہیں جو روایت کی پاسداری اور جدت کی جستجو کو یکجا کرتی ہے۔بقول منور امین:

> "اظہار ابھی مشکل ہے" کے عنوان سے محمد اظہار الحق کے چوتھے شعری مجموعے "پانی پر بچھا تخت" کے تاثرات کے ساتھ ساتھ پہلے تین مجموعوں کی انفرادیت اور ان کی شاعرانہ حیثیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔" (۲۵)

"خوشبو جو بکھر گئی" میں منشا یاد نے پروین شاکر کی شاعری اور شخصیت دونوں کا نہایت دلگداز اور حقیقت پسندانہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ابتدا میں وہ اس تاثر کو رد کرتے ہیں کہ پروین شاکر کی شہرت کا سبب صرف ان کی نسوانی دل کشی تھی اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان کی اصل مقبولیت ان کے کلام کی تازگی اور تاثیر سے وابستہ تھی۔ان کے نزدیک پروین شاکر نے اُردو شاعری کو بالخصوص خواتین کے احساسات، جذبات اور داخلی کیفیات کے اظہار کے لیے ایک نئی زبان عطا کی اور اسی وجہ سے وہ نوجوان نسل اور بالخصوص خواتین میں غیر معمولی مقبول ہوئیں۔منشا یاد اس بات کو بھی اجاگر کرتے ہیں کہ مردوں کے زیرِ اثر ادبی معاشرے میں ایک خاتون کا اتنی بڑی کامیابی حاصل کرنا معمولی بات نہ تھی بل کہ یہ ان کی فنی اور شخصی قوت کی دلیل ہے۔مضمون میں پروین شاکر کی نجی زندگی کے چند پہلوؤں اور ان پر کی جانے والی تنقید و حسد کا بھی ذکر ملتا ہے جو ان کی عظمت کو اور زیادہ نمایاں کرتا ہے۔

ان کے شعری مجموعے قارئین میں بے حد مقبول رہے اور ان کے اشعار نے صنفی حساسیت کے ساتھ ساتھ عصری حقیقتوں کو بھی چھوا۔منشا یاد نے ان کی ناگہانی موت کے المیے کو بھی نہایت کربناک انداز میں بیان کیا ہے اور دکھایا ہے کہ کس طرح ایک پوری فکری دنیا اچانک بکھر گئی۔پروین شاکر کے جنازے کا منظر، عوام اور ادبی دنیا کا غم اور ان کی والدہ کی حالت کو مصنف نے اس طرح قلم بند کیا ہے کہ قاری پر سانحے کی شدت پوری طرح آشکار ہو جاتی ہے۔اس مضمون میں جہاں پروین شاکر کے فن کی تازگی اور اثر انگیزی کو تسلیم کیا گیا ہے وہیں ان کی انسانی اور نسوانی جدوجہد کو بھی خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔یوں یہ تحریر نہ صرف ایک شاعرہ کی ادبی و شخصی عظمت کا اعتراف ہے بل کہ ہمارے معاشرے کی اس تلخ حقیقت کی یاد دہانی بھی ہے کہ ہم اکثر اپنے بڑے فن کاروں کی قدر ان کے بعد کرتے ہیں۔

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

"سخن اس کے ستارے ہیں"میں منشا یاد نے عائشہ مسعود کی شاعری کے ساتھ ساتھ ادبی تقریبات کے ماحول اور ان کے اثرات کو بھی ہلکے طنزیہ اور نیم مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے۔ابتدا میں وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اکثر کتابوں کی پذیرائی ادبی محفلوں اور تقاریب کے ذریعے ہی ہوتی ہے اور وہاں تعریف و توصیف کے جملے اکثر عملی فائدہ دیتے ہیں۔لیکن اس ظاہری رنگینی کے ساتھ وہ عائشہ مسعود کے فن کو سنجیدگی سے دیکھتے ہیں اور یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی شاعری محض خوشامدی تعریف پر نہیں کھڑی بل کہ واقعی ایک داخلی صداقت اور نسائی لہجے کی تازگی رکھتی ہے۔

ان کی غزلوں کو تغزل، روانی اور بے ساختگی کا حامل قرار دیتے ہوئے یہ واضح کرتے ہیں کہ ان میں عورت کی داخلی دنیا اور اس کے احساسات کا ایسا عکس ہے جو اُردوغزل کو ایک نرم مگر پراثر زاویہ عطا کرتا ہے۔اسی طرح ان کی نظموں میں زمانے کے مسائل اور عشق و محبت کے تجربات دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں جو ان کے فن کو ہمہ گیر اور زندہ بناتے ہیں۔منشا یاد ان کے چاروں مجموعوں کے ارتقائی سفر کو دیکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ان کی شاعری میں فکری اور فنی سطح پر مسلسل نکھار آتا رہا ہے۔یوں یہ مضمون صرف عائشہ مسعود کی شاعری کی خوبیوں کو بیان نہیں کرتا بل کہ ادبی دنیا کے مزاج اور اس کے باہمی تعلقات پر بھی روشنی ڈالتا ہے جس سے تحریر میں گہرائی کے ساتھ ایک دل کش رنگینی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

"کچھ بچا ہی لائے ہیں" میں منشا یاد نے اختر عثمان کی شاعری اور شخصیت دونوں پر گہرا اور دل چسپ تبصرہ کیا ہے۔ابتدا ہی میں وہ ہلکے پھلکے طنز سے بتاتے ہیں کہ انتخاب کی صورت میں شاعر دراصل اپنے کلام کو وقت کے دریا میں غرق ہونے سے بچا لیتا ہے اور یوں پہلی کتابوں کو پس منظر میں دھکیل دیتا ہے۔لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی تسلیم کی گئی ہے کہ انتخاب کی خوبی یہی ہے کہ یہ غیر ضروری اور کمزور کلام سے نسبتاً پاک ہوتا ہے اور قاری کو شاعر کے اصل جوہر دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ منشا یاد نے واضح کیا ہے کہ اختر عثمان کی شاعری کا حسن یہ ہے کہ وہ نہ تو عروضی اغلاط میں الجھتی ہے اور نہ ہی محض بناوٹی تصنع کا شکار ہوتی ہے بل کہ اس کے ہاں ہر خیال ذاتی تجربے اور قلبی واردات سے

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

جنم لیتا ہے۔ان اشعار میں روایت شکنی کی جھلک بھی نمایاں ہے اور بعض اوقات شاعر اپنے باغیانہ رویے سے قاری کو چونکا دیتا ہے۔

منشا یاد نے اس پہلو کو بھی اجاگر کیا کہ اختر عثمان کی تنقیدی گفت گو اپنی مثال آپ ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ صرف شاعر نہیں بل کہ ایک کامیاب ناقد بھی ہے جس کی بات کو سنجیدگی سے لیا جاتا ہے۔تاہم مضمون میں یہ حقیقت بھی بیان ہوئی ہے کہ اس کے کلام میں کبھی کبھار کمزور اشعار اور پامال مضامین بھی موجود ہیں مگر مجموعی طور پر زبان و بیان کی تازگی اور فکری قوت ان کمزوریوں پر غالب آ جاتی ہے۔مضمون میں ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ اختر عثمان محض جمالیاتی اور عشقیہ شاعری تک محدود نہیں رہتے بل کہ ان کی تخلیقات میں تہذیبی اور معاشرتی احساسات بھی جھلکتے ہیں اگرچہ سیاسی حوالوں کی شدت اس کتاب میں کم دکھائی دیتی ہے۔منشا یاد کے اس تجزیے میں جہاں طنز اور مزاح کی ہلکی پھلکی خوشبو ہے وہیں ایک سنجیدہ ادبی بصیرت بھی جھلکتی ہے جو شاعر کے فنی محاسن اور اس کی فکری جہتوں کو متوازن طور پر سامنے لاتی ہے۔بقول منشایاد:

> "میں سمجھتاہوں کہ اختر عثمان ایک ذہین اور صاحب مطالعہ نوجوان ہی نہیں،ایک بہت اچھا ،جدید شاعر اور نقاد بھی ہے۔ مجلسی تنقید میں کچھ خرابیاں بھی ہوتی ہیں۔اللہ کرے اس کی تنقیدی اور تخلیقی صلاحیتیں ان سے محفوظ رہیں۔اگرچہ وہ تنقید لکھتا کم اور بولتا زیادہ ہے مگر جب کبھی لکھتاہے تو اس کی نثر بھی بہت خیال انگیز،خوب صورت اور عمدہ ہوتی ہے۔"(۲۶)

"کنول جھیل کا گیت "میں منشا یاد نے خلیق الرحمن کی شاعری خصوصاً نظم نگاری کا تفصیلی اور بصیرت افروز تجزیہ کیا ہے جس میں ان کے فنی سفر کی نوعیت اور امتیاز نمایاں کیا گیا ہے۔منشا یاد نے ابتدا ہی میں غزل کے مقابلے میں نظم کے مشکل راستے کی نشان دہی کی اور بتایا کہ خلیق نے اس راستے کا انتخاب کر کے اپنے تخلیقی امکانات کو وسعت بخشی ہے۔ان کی شاعری میں مناظر فطرت کا جادو، مظاہر کائنات کی تصویریں اور حسن کی تلاش نمایاں ہے جو انھیں ورڈز ورتھ کی یاد دلاتا ہے۔ان نظموں میں حسن محض سطحی تاثر نہیں بل کہ اس کے اندر ایک داخلی اداسی اور نارسائی کا لمس بھی شامل ہے جو فنی گہرائی پیدا کرتا ہے۔

منشایادنے اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ خلیق کی شاعری میں علامتوں اور استعاروں کے ذریعے

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

ایسے منظرنامے تخلیق کیے گئے ہیں جو بیک وقت تصویری بھی ہیں اور معنیاتی بھی اور قاری کو کائنات کی وسعتوں اور انسانی وجود کے سوالات تک لے جاتے ہیں۔ شاعر کے ہاں اگرچہ ایک مسلسل تلاش اور سوالیہ کیفیت ہے لیکن اس کے باوجود انسان اور زندگی سے امید اور محبت کی کرن باقی رہتی ہے جس سے وہ مایوسی اور موت کے خوف پر قابو پا لیتا ہے۔ منشا یاد نے اس حقیقت پر بھی روشنی ڈالی کہ خلیق کے اندر ایک ایسا بچہ زندہ ہے جو اپنے معصوم بچوں کے ساتھ آج کے مادہ پرست معاشرے میں بے وقعت نظر آتا ہے مگر فن کے ذریعے اس کی آواز سنائی دیتی ہے اور یہی آواز اسے معاصر شعرا میں منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ اس تنقیدی مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ خلیق الرحمن محض فطرت کے مصور نہیں بل کہ اپنے زمانے کی بے معنویت، انسانی تنہائی اور روحانی سوالات کے شاعر بھی ہیں اور یہی ان کے کلام کو جمالیاتی کشش کے ساتھ فکری گہرائی بھی عطا کرتا ہے۔

منشا یاد کی اس کتاب کا پانچواں باب "انشائیے" کے عنوان سے ہے۔ منشا یاد نے اپنی کتاب "منشائیے" میں شامل اس باب کے مضمون "تین میں بھی تیرہ میں بھی" کے ذریعے جمیل آذر کی انشائیہ نگاری کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ان کی ادبی قدر و قیمت کو اجاگر کیا ہے۔ یہ مضمون اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ منشا یاد نے محض روایت کو دہرانے پر اکتفا نہیں کیا بل کہ جمیل آذر کی تخلیقی بصیرت اور ادبی انفرادیت کو سامنے لایا۔ جمیل آذر کی انشائیہ نگاری میں شگفتگی، مشاہدے کی باریکی اور روزمرہ زندگی کی سادہ باتوں کو فن کارانہ رنگ دینے کی صلاحیت نمایاں ہے۔ منشا یاد اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جمیل آذر نے انشائیے کو محض تفریح کا ذریعہ نہیں رہنے دیا بل کہ اسے فکری اور سماجی حوالوں سے بھرپور فن پارہ بنایا۔ ان کے نزدیک جمیل آذر کی تحریر قاری کو مسکرانے پر مجبور کرتی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ سوچنے کے دروازے بھی کھول دیتی ہے جو ان کی انشائیہ نگاری کی اصل اہمیت ہے۔

اسی طرح مضمون "جھاڑیاں اور جگنو" میں منشا یاد نے اکبر حمیدی کی انشائیہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی فنی خوبیوں کو واضح کیا ہے۔ اکبر حمیدی کے انشائیوں میں زبان کی روانی، اُسلوب کی تازگی اور موضوعات کی رنگا رنگی قابل ذکر ہے۔ منشا یاد کے مطابق اکبر حمیدی کے یہاں حقیقت نگاری اور فکری گہرائی ایک ساتھ نظر آتی ہے۔ وہ عام زندگی کے چھوٹے چھوٹے مناظر اور تجربات کو نہ صرف دل چسپ پیرائے میں بیان کرتے ہیں بل کہ ان کے اندر پوشیدہ معنویت کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ منشا یاد نے یہ واضح کیا ہے کہ اکبر حمیدی کی انشائیہ نگاری محض ہنسی مذاق

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

پر مبنی نہیں بل کہ اس میں انسانی رویوں کی جھلک اور معاشرتی مشاہدات کی گہری پرتیں موجود ہیں۔ اس پہلو نے ان کے انشائیوں کو ایک الگ مقام عطا کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ منشایاد نے ان کی تحریروں کو سنجیدہ ادبی سرمایہ قرار دیا۔

"منشائیے" کا چھٹا باب "سفر نامہ" ہے۔ اس باب میں مجموعی طور پر تین سفر ناموں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ پہلا تبصرہ "چل نئی پری کے دیس" کے عنوان سے ہے۔ منشایاد کے الفاظ میں جمیل یوسف کے سفر نامے "جل پری کے دیس میں" کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ یہ محض ایک سیاحتی روداد نہیں بل کہ ایک جمالیاتی اور فکری تجربہ ہے جس میں مصنف نے مشاہدے کو شاعرانہ اختصار اور اُسلوب کی لطافت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی تحریر میں مناظر، شہروں اور لوگوں کی تصویریں ایسے ابھرتی ہیں جیسے قاری کے سامنے حقیقتاً کھڑکی کھل گئی ہو اور اس اثر آفرینی میں ان کا شعری پس منظر نمایاں ہے کیوں کہ وہ کم لفظوں میں بڑے اور معنی خیز تاثرات منتقل کرنے پر قادر ہیں۔ منشایاد اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ سید ضمیر جعفری کی شگفتہ ہم سفری نے اس سفر نامے کو مزید دل کش بنا دیا ہے جگہ جگہ ان کے جملے موتیوں کی طرح جملوں میں پروئے گئے ہیں جنھوں نے تحریر کو ایک ہلکی پھلکی مسکراہٹ اور زندگی کی روانی بخش دی ہے۔

مصنف نے اسکینڈے نیویا کے معاشرتی ڈھانچے، انصاف کے نظام، عورت کے مقام اور انسانی حقوق کی پاسداری کو پاکستانی حالات کے پس منظر میں پیش کر کے قاری کو سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ ترقی یافتہ معاشرے اپنے شہریوں کو کس طرح سہولتیں اور عزت نفس مہیا کرتے ہیں۔ یہی تقابلی مطالعہ اس سفر نامے کی اصل فکری جہت ہے۔ ساتھ ہی حسن پرستی اور جمالیات کے حوالے سے جمیل یوسف کا زاویۂ نظر بار بار جھلکتا ہے جسے وہ نیکی اور صداقت کے ہم معنی قرار دیتے ہیں۔ یوں یہ سفر نامہ صرف جغرافیائی مشاہدات کا بیان نہیں بل کہ تہذیبی، سماجی اور جمالیاتی شعور کا امتزاج ہے جو مصنف کو اُردو سفر نامہ نگاری کی روایت میں ایک نمایاں مقام دیتا ہے۔ بقول منشایاد:

> "جمیل یوسف نے اس مختصر سے سفر نامے میں سویڈن کی تمدنی زندگی، تہذیب، ثقافت، آثار قدیمہ، رسم و رواج، سیر وسیاحت کے مراکز، پارکوں اور اس علاقے کی قدرتی خوبصورتی، موسم، جغرافیہ اور رہن سہن سب کچھ سمیٹ لیا ہے۔" (۲۷)

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

اسی طرح ریاض الرحمن ساغر کا سفر نامہ "چلو چین چلیں" پر تبصرہ کرتے ہوئے منشایاد یہ ثابت کرتے ہیں کہ مصنف کی شعری پس منظر نے ان کے سفرنامے کو ایک الگ رنگ دیا ہے کیوں کہ وہ محض مناظر یا عمارتوں کا ذکر نہیں کرتے بل کہ ہر تجربے کو اپنی تخلیقی شخصیت کے آئینے میں دیکھتے ہیں اور قاری کو ایک جمالیاتی لذت فراہم کرتے ہیں۔ان کی شاعری کی طرح یہ سفرنامہ بھی عوامی رنگ رکھتا ہے اور عام قاری کے ذوق کے قریب ہے۔چین کے بارے میں وہ صرف تعریفی جملے نہیں لکھتے بل کہ اس ملک کی تہذیب، ترقی اور پاکستان سے اس کی گہری دوستی کو جذبے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔منشایاد اس بات کی بھی نشان دہی کرتے ہیں کہ سفرنامے میں ان کا ہلکا پھلکا اور برجستہ انداز قاری کو بوجھل ہونے نہیں دیتا بل کہ پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی دوست محفل میں بیٹھ کر باتیں سنا رہا ہو۔ساتھ ہی مصنف کی اصول پسندی اور اخلاقی معیار کی جھلک بھی جگہ جگہ نمایاں ہے جو ان کی شاعری کی طرح ان کے سفرنامے میں بھی جھلکتی ہے۔موضوعاتی طور پر یہ سفرنامہ چین کی تہذیب و ترقی کی جھلک کے ساتھ ساتھ پاکستانی فن و ثقافت کی یادوں اور مصنف کے ذاتی تخلیقی سفر کا بھی آئینہ دار ہے اور یہی امتزاج اسے اُردو سفرنامہ نگاری میں ایک دل کش اور مختلف تجربہ بنا دیتا ہے۔

"منشایئے" کے اس باب کا آخری تبصرہ "ٹپر واسنی" ہے۔اس مضمون میں منشایاد نے یہ ثابت کیا ہے کہ پروین عاطف کا سفرنامہ "ٹپر واسنی"

ان کے مشاہدے، علم اور اُسلوب کی بھرپور عکاسی کرتا ہے اور یہ ان کے پہلے سفرناموں "کرن ، تتلے ور بگولے" کے بعد ایک ایسا اضافہ ہے جس نے ان کے مقام کو اور زیادہ مستحکم کیا۔اس مجموعے میں شامل پانچ سفر لکھنؤ، ارجنٹینا، ایمسٹرڈیم، چین اور ہیروشیما جغرافیائی روداد بھی ہیں اور تہذیبی و تاریخی شعور کے آئینہ دار بھی۔

منشایاد نے اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ پروین عاطف نے جہاں بھی سفر کیا وہاں کی تہذیب، تاریخ اور جغرافیہ کو اپنی تحریر میں سمو دیا جس سے قاری کے لیے اجنبی معاشرے بھی مانوس اور دل چسپ ہو جاتے ہیں۔ان کی سب سے بڑی خوبی ان کا اُسلوب ہے جو بے ساختہ، کھلا ڈلا اور پنجابی الفاظ کے بر محل استعمال سے نہ صرف دل کشی پیدا کرتا ہے بل کہ منظر نگاری کو جان دار بنا دیتا ہے۔ان کے ہاں رومانوی رنگ یا نظریاتی تعصب کی بجائے حقیقت پسندانہ مشاہدہ اور داخلی کلامی ہے جس سے ان کی

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

تحریریں فکری گہرائی بھی اختیار کر لیتی ہیں۔ منشایاد مجموعی طور پر اس بات کی دلیل دیتے ہیں کہ "ٹپر واسنی" کی خوبی یہ ہے کہ مصنفہ نے باہر کی دنیا کو صرف آنکھ سے نہیں دیکھا بل کہ اپنے باطن کی آنکھ سے بھی پرکھا اور ہر جگہ اپنے پاکستانی تشخص کو برقرار رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سفرنامے قاری کے ذہن میں صرف تصویریں نہیں ابھارتے بل کہ ایک فکری ربط اور ثقافتی شناخت بھی تازہ کرتے ہیں۔ اس طرح پروین عاطف اُردو سفرنامہ نگاری میں خواتین کے اُسلوب کو ایک منفرد اور معتبر مقام دیتی ہیں۔

"منشایئے" کا آخری باب "کالم والم" ہے۔ اس باب میں منشایاد نے فریدہ حفیظ کے کالم مجموعہ "ادبی کالمات" کو اُردو ادب کی ادبی تاریخ اور تحقیق کے لیے ایک قیمتی دستاویز قرار دیا ہے۔ منشایاد کے اس مضمون سے یہ تاثر قوی ہوتا ہے کہ فریدہ حفیظ کے کالم نہ صرف راولپنڈی اور اسلام آباد کے ادبی حلقوں، انجمنوں اور تقریبات کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں بل کہ ادب کو دیگر فنون لطیفہ جیسے موسیقی، مصوری، تھیٹر، اسٹیج، ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے جوڑ کر ایک جامع ادبی منظرنامہ فراہم کرتے ہیں۔ فریدہ حفیظ کی سب سے بڑی خوبی ان کا مشاہدہ، جامعیت اور تاریخی تناظر ہے؛ انھوں نے کسی بھی قابل ذکر ادبی شخصیت، دل چسپ واقعہ یا سرگرمی کو نظر انداز نہیں کیا بل کہ اسے تفصیل اور صحت کے ساتھ قلم بند کیا۔ ان کے کالم نہ صرف قاری کو معلومات فراہم کرتے ہیں بل کہ تحقیق کاروں، مقالہ نگاروں اور طلبہ کے لیے حوالہ جاتی مواد بھی بن جاتے ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو "منشایئے" میں منشا یاد کے مضامین ایک منفرد اور شگفتہ اُسلوب کے حامل ہیں جن میں معلومات، تجربات اور مشاہدات کی گہرائی کا ایسا امتزاج ملتا ہے جو ان کے قارئین کو ہر پہلو سے محظوظ اور متاثر کرتا ہے۔ ان کے مضامین کا بنیادی مزہ یہ ہے کہ وہ محض واقعات کی رپورٹنگ تک محدود نہیں رہتے بل کہ ہر منظر، ہر شخصیت، ہر واقعہ اور ہر ادبی یا ثقافتی ماحول کے پس پردہ انسانی، سماجی اور تہذیبی پہلوؤں کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر صنم شاکر:

> "۳۸۷ صفحات پر مشتمل اس مجموعے کی اہمیت منشایاد کے افسانوں کی طرح ہے۔ جس طرح منشایاد کے افسانے اپنی نوعیت کے لحاظ سے اہم ہیں اس طرح یہ متفرقات بھی ایک نئے پہلو سے منشایاد کا تعارف پیش کرتے ہیں۔" (۲۸)

منشا یاد کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کے تجزیے اور تبصرے ہیں جو نہ صرف معلوماتی

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

ہوتے ہیں بل کہ فکری بصیرت بھی فراہم کرتے ہیں۔ان کے تجزیے ہمیشہ وسیع نقطہ نظر سے کیے جاتے ہیں جس میں کسی واقعے یا شخصیت کے سماجی، ثقافتی، تاریخی اور ادبی پہلو یکجا کر دیے جاتے ہیں۔مثال کے طور پر انھوں نے ادبی حلقوں میں ہونے والے مشاعروں اور تقریبات کو محض تفریحی یا تقریری واقعات کے طور پر نہیں پیش کیا بل کہ ہر فرد کے کردار، اس کے اُسلوب اور اس کے تاثرات کے اثرات کی بھی وضاحت کی۔اسی طرح انھوں نے کسی ادبی شخصیت کے حالات، مشاہدات اور رد عمل کو نہایت دقت سے بیان کیا جس سے قاری اس شخصیت کے ذہنی اور جذباتی عالم میں خود بخود داخل ہو جاتا ہے۔ان کے مضامین میں تاریخ اور حال کا امتزاج بھی نمایاں ہے۔ وہ ماضی کی معلومات اور حال کے مشاہدات کو اس طرح یکجا کرتے ہیں کہ قاری کو دونوں کا مربوط اور جامع تاثر ملتا ہے۔واقعات کو جزئیات کے ساتھ بیان کرنے میں انھیں ملکہ حاصل ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے منشایاد کی نثر اپنے اندر ادبی لطافت، فکری گہرائی اور فنی پختگی کا ایسا حسین امتزاج رکھتی ہے جو انہیں معاصر اردو منشائیہ نگاروں میں منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ان کی تحریر میں سادگی اور سلاست کے ساتھ ادبی چاشنی اس انداز سے رچی بسی ہے کہ قاری ابتدا سے آخر تک متن سے وابستہ رہتا ہے۔وہ محض واقعات کی لفظی ترجمانی نہیں کرتے بلکہ اپنی تخلیقی بصیرت، باریک بینی اور جمالیاتی شعور کے ذریعے عام مشاہدات کو بھی ادبی تجربے میں تبدیل کر دیتے ہیں۔یہی خصوصیت ان کی نثر کو محض معلوماتی یا بیانیہ نہیں رہنے دیتی بلکہ اسے ایک مؤثر فنی اظہار کا درجہ عطا کرتی ہے۔

منشایاد کے اسلوب کا نمایاں وصف تشبیہات، استعارات، تمثیلات اور تصویری پیکروں کا فطری استعمال ہے۔ان کی یہ ادبی صنعتیں تصنع یا لفظی آرائش کے لیے نہیں بلکہ معنی کی گہرائی، منظر کی تشکیل اور احساس کی شدت کو مؤثر انداز میں منتقل کرنے کے لیے بروئے کار آتی ہیں۔وہ روزمرہ زندگی کے معمولی واقعات، دیہی ماحول، پنجابی ثقافت، مقامی محاوروں اور عوامی تجربات سے ایسی تشبیہیں اخذ کرتے ہیں جو قاری کے ذہن میں پورا منظر زندہ کر دیتی ہیں۔ان کی منظر نگاری اس قدر جاندار ہوتی ہے کہ قاری خود کو بیان کردہ ماحول، کرداروں اور واقعات کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہی تصویریت اور جادو بیانی ان کے سفرناموں، شخصی خاکوں، ادبی یادداشتوں اور تاریخی واقعات کی پیش کش میں نمایاں طور پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ان کی نثر کا ایک اور قابلِ ذکر وصف یہ ہے کہ بے تکلفی اور شگفتگی کے باوجود اس میں فکری سنجیدگی اور تنقیدی بصیرت ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ وہ بظاہر معمولی واقعات سے ایسے نتائج اخذ کرتے ہیں جو سماجی، تہذیبی اور ادبی شعور کو نئی معنویت عطا کرتے ہیں۔ان کے ہاں مزاح کبھی سطحی تفریح

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

کا ذریعہ نہیں بنتا بلکہ انسانی نفسیات، معاشرتی تضادات اور تہذیبی رویوں کی تفہیم کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین میں تفریح اور تفکر، جذبات اور عقل، مشاہدہ اور تجزیہ ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

منشایاد کی تحریروں میں قومی اور ثقافتی شعور بھی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اپنی شناخت اور تہذیبی وابستگی پر فخر محسوس کرتے ہیں اور پاکستانی معاشرت، خصوصاً پنجابی تہذیب، دیہی زندگی، لوک روایت، زبان اور فنونِ لطیفہ کو اپنی نثر کا لازمی حصہ بناتے ہیں۔ ان کے ہاں مقامی ثقافت محض پس منظر نہیں بلکہ ایک فعال ادبی عنصر کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو متن کو معنوی وسعت اور تہذیبی گہرائی عطا کرتا ہے۔ وہ لوک دانش، علاقائی محاورات، ادبی روایات اور ثقافتی علامات کو اس مہارت سے اپنے اسلوب میں سمو دیتے ہیں کہ قاری نہ صرف ایک مخصوص تہذیبی فضا سے آشنا ہوتا ہے بلکہ اس کے جمالیاتی حسن سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر منشایاد کے مضامین کا اسلوب فکری گہرائی، فنی پختگی، شگفتگی، حقیقت نگاری اور تہذیبی شعور کا دل کش امتزاج پیش کرتا ہے۔ ان کی نثر میں الفاظ کا انتخاب نہایت برمحل، جملوں کی ساخت رواں اور مؤثر، مشاہدات دقیق، تجزیہ متوازن اور اظہار نہایت فطری ہے۔ وہ ذاتی تجربے کو اجتماعی شعور، مقامی ماحول کو آفاقی احساس، اور روزمرہ زندگی کو ادبی جمالیات میں ڈھالنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ یہی اوصاف ان کے مضامین کو محض شخصی یادداشت یا تاثراتی نثر سے بلند کر کے اردو ادب میں فکری، فنی اور تہذیبی اعتبار سے ایک ممتاز مقام عطا کرتے ہیں۔

## حوالہ جات

۱۔ فرخ جمیل، بالمشافہ گفت گو، رہائش گاہ، اسلام آباد، ۳۱ جنوری ۲۰۲۶ء

۲۔ اسلم سراج الدین، محمد منشایاد: شخصیت اور فن (پاکستانی ادب کے معمار)، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء ص ۸۵

۳۔ منشایاد، منشایئے (شگفتہ تحریریں)، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۸

۴۔ منشایاد، منشایئے (شگفتہ تحریریں)، ص ۲۰

۵۔ ایضاً، ص ۳۵

۶۔ ایضاً، ص ۴۲

۷۔ ایضاً، ص ۴۹

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
**Volume 7, Issue 3, (May to June 2026)**
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-III)urdu-5

ماخذ تحقیقی مجلہ

۸۔ ایضاً، ص ۵۶

۹۔ ایضاً، ص ۸۴

۱۰۔ ایضاً، ص ۸۴

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۱۴

۱۲۔ لطیف کاشمیری، خیابانِ مری، بابر برادرز بک سیلر، راولپنڈی، ۱۹۷۱ء، ص ۳

۱۳۔ منشایاد، منشایئے (شگفتہ تحریریں)، ص ۱۳۸

۱۴۔ قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۲

۱۵۔ منشایاد، منشایئے (شگفتہ تحریریں)، ص ۱۵۸

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۶۹

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۸۷

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۹۴

۱۹۔ وزیر آغا (مدیر)، اوراق، شمارہ ۱۲، جلد نمبر ۱ / ۲، دفتر اوراق، لاہور، جنوری / فروری ۱۹۷۶ء، ص ۱۰

۲۰۔ منشایاد، منشایئے (شگفتہ تحریریں)، ص ۲۱۹

۲۱۔ ایضاً، ص ۲۴۴

۲۲۔ ایضاً، ص ۲۵۷

۲۳۔ ایضاً، ص ۲۶۹

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۸۵

۲۵۔ ایضاً، ص ۳۱۴

۲۶۔ ایضاً، ص ۳۳۵

۲۷۔ ایضاً، ص ۳۶۴

۲۸۔ صنم شاکر، منشایاد: احوال و آثار، تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اردو)، وفاقی جامعہ اردو برائے فنون، سائنس و ٹیکنالوجی، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۲۴۸